کچے رنگوں کا شہر

لندن



اجیت کور

کچّے رنگوں کا شہر

لندن

اجیت کور

مرتبہ: آصف نواز

چودھری اکیڈیمی۔ لاہور
الفضل مارکیٹ۔ ۱۷۔ اُردو بازار

ناشر........محمد طارق
مطبع......شکر گنج پرنٹرز لاہور
قیمت......ساٹھ روپے

کچّے رنگوں کا شہر



لندن



اجیت کور سے ایک مُلاقات

اوتار لندن

وہاں، میں ٹھیک دو بجے لیسٹر سکوئیر میں 'ایتھنا' نام کی دکان کے سامنے ہوں گی ' اس نے وعدہ کیا تھا ـــــــ 'اور اکٹھے کوئی پلے وغیرہ دیکھنے کا پروگرام بنالیں گے'۔

اجیت کور کو میں پہلے بھی مل چکا تھا، لندن میں بھی اور دہلی میں بھی۔ اور یہ بھی سمجھتا تھا، کہ اگر اس کو کسی کے گھر سماجی محفل اور باہر جاکر فلم یا ناٹک وغیرہ دیکھنے میں سے کسی ایک چیز کا انتخاب کرنا پڑے، تو وہ فلم یا پلے دیکھنے ہی جائے گی۔

آج دل میں یہ بھی تھا، کہ کچھ وہ بھی باتیں کریں گے، جن کا ذکر پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔ ویسے اس کی سوانح عمری 'خانہ بدوش' شائع ہونے سے کسی کو بھی اس کی زندگی میں گزرے بہت سے واقعات کے بارے پردہ نہیں رہ گیا تھا۔

پنجابی سماج میں ایک عورت ہونے کے ناطے اس کا وجود کن کن ٹوٹ پھوٹ سے نکلا تھا، اور آخر کن مقامات پر پہنچی، اس کا ذکر اس نے حیران کر دینے والے فنکارانہ ڈھنگ سے کیا تھا۔ اپنے پر ہوئے ظلم، اپنی بے بسی، اپنے عشقوں کو اتنی بے باکی سے قلمبند کیا تھا، کہ اس داستان نہ صرف دبی کچلی پنجابی عورت کی داستان ہی بنی، بلکہ مجھے اس کے اندر اپنی غلامی کی سب کڑی بیڑیاں تڑوا چکی عورت کی روح کی جھلک نظر آتی تھی۔

پکاڈلی کی طرف سے لیسٹر سکوائیر کی طرف جاتے ہوئے دُور ہی سے اس کا دھوپ

میں چمکتا ما تھا نظر آیا۔ کئی دنوں کے بعد لندن میں دھوپ نکلی تھی، اور مجھے کئی سال پہلے پڑھے اس کے ناولٹ "دھوپ والا شہر" کی یاد آگئی۔

وہ ملی، تو ہمیشہ کی طرح بے تکلف تھی۔

"بھئی، رات کو ایک فلم دیکھی "آئیز آف دی برڈز" مزہ آگیا۔ ایک ایسے ملک کی کہانی، جس میں اتنا اپریشن ہے، اتنا اپریشن ہے، کہ لوگوں کا پتہ ہی نہیں لگتا، کہ کب غائب ہو جاتے ہیں، کدھر چلے جاتے ہیں۔ کوئی پتہ نہیں، کہ کتنے عرصے سے جیلوں میں بند ہیں..... اور ایک آرٹسٹ جیل میں کسی کو اپنی پینٹنگ دینے جاتا ہے۔ گیٹ پر کھڑے گارڈز اس کو اندر نہیں جانے دیتے۔ اس پینٹنگ کا نام ہے، "آئیز آف دی برڈز" چھوٹے چھوٹے پرندے، ان کی آنکھیں....."

پرندوں کی آنکھیں، اور پرندوں کی اڑان کی بات کرتے ہوئے اس کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔ مجھے وہ خود بھی ایک پرندہ معلوم ہوئی۔ کتنی ہی دیر وہ چھوٹی چھوٹی تفصیل بیان کرتی رہی۔

باتوں باتوں میں ہم نے نیشنل تھیٹر میں دکھائے جا رہے پلے "دی روڈ ٹو مکہ" کی ٹکٹیں لینے کا فیصلہ کیا۔ اس کے بعد ہمارے پاس وقت تھا، چہل قدمی کرنے کا، چائے پینے کا، اور تبادلہ خیالات کا۔

"تمہارے کری ایٹو موومنٹس کس طرح کے ہوتے ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"جب کوئی چیز اندر کروٹ لے رہی ہو، تو بخار سا چڑھ جاتا ہے۔ اپنی بیٹی ارپنا کو ہی دیکھتی ہوں، کہ کسی دن اچانک یہ پوچھنے پر، کہ روٹی کھانی ہے، اس کے منہ سے ایک لمبی سی "ہوں..... آ" نکلے گی۔ اس لمبی "ہوں..... آ" کا مطلب ہوتا ہے، کہ کچھ کری ایٹو ہونے والا ہے۔

"میرے اندر کسی بھی تخلیق کی روپ ریکھا ایک دن میں ہی نہیں بن جاتی۔

آہستہ آہستہ بہت سے واقعات جڑتے رہتے ہیں۔ جب لکھنے بیٹھتی ہوں، تو کہانی پوری کی پوری بنی بھی نہیں ہوتی۔ ایک خیال سا ہی ہوتا ہے۔'

'تم اپنا لکھا دوبارہ سنوارتی اور کاٹتی بھی ہو؟'

'ہاں، ایک آدھ بار ایسا کرنے کی ضرورت پڑتی ہے۔'

'شروع میں کیسا لکھا؟'

'شروع میں ہر لکھاری یا تو شاعری لکھتا ہے، اور یا عشق کی کہانیاں لکھتا ہے۔ میں نے شاعری نہیں لکھی، عشق کی کہانیاں لکھیں۔'

'تم آخر لکھتی کیوں ہو؟'

'لکھنے کے بغیر کیسے رہ سکتی ہوں۔ اپنے اندرونی درد کی ٹیسیں کم کرنے کا اور خود کو دوبارہ تخلیق کا میرا یہ ذریعہ ہے۔ اپنی قلم سے دنیا کو پلٹ دینے جیسی بھی مجھے کوئی غلط فہمی نہیں۔ آج کی دنیا میں رِٹن ورڈ کی کوئی طاقت بھی نہیں۔ طاقت ہے سیاستدانوں کے پاس، میڈیا کے پاس، اور وہ بھی براہ راست یا بالواسطہ ڈھنگ سے سیاست یا بزنس، اور پیسے سے ہی جڑا ہوا ہے۔ لکھنے والوں نے تو صرف سوچ پیدا کرنی ہوتی ہے۔ مجھے پورا احساس ہے، کہ غلط سماجی قیمتوں کا کھونٹا ہمارے الفاظ سے گرے گا نہیں، لیکن یقین یہ بھی ہے، کہ اس کی ایک آدھ اینٹ ہلا کر ہی دم لیں گے۔'

'ادبی گروہ بندیوں، اور ادبی محفلوں میں تم کم ہی جاتی ہو۔ کیا تمہارا ان میں یقین نہیں؟'

'مجھے کوئی بلاتا ہی کم ہے۔ میرا ان میں یقین ہے، لیکن میں ان روائتی گروہ بندیوں سے کتراتی ہوں، جن کا کام ایک دوسرے کی ٹانگ کھینچنے کے علاوہ کچھ بھی نہیں۔ خالص ادیبوں کی جتھے بندی بھی میرے خیال کے مطابق چل نہیں سکتی۔ کوئی پرزہ ان

کو چلانے کے لئے ہونا چاہیئے۔ کوئی مشترکہ آدمی چاہے وہ پبلشر ہی کیوں نہ ہو، انتظام کرنے والا۔ جتھے بندی کا برا ہونا بھی ضروری نہیں۔ مگر مل کر بیٹھنے کا رول برا تنگ را ہے، چاہے، کوئی چھوٹا سا گروپ ہی ہو۔ ہندی میں کئی سال تین ادیبوں کملیشور، موہن راکیش، اور راجندر یادیو کی منڈلی تھی۔ یہ تین مل کر بیٹھے تھے۔ اوم پرکاش نے جو ادارہ راج کمل پبلشنگ ہاؤس اور "نئی کہانیاں" کو چلاتے تھے، اُنہوں نے لنک پبلیکیشنز کی اُوپری منزل لے لی۔ اور ہر پندرھویں روز، شاید ہفتہ کا دن ہوتا تھا۔ یہاں میٹنگیں ہوتیں۔ پنجابی میں بھی موہن سنگھ، دُگل، امرتا، خشونت لاہور یا جالندھر میں اکٹھے ہوتے، اور انہوں نے ادب پر انمٹ نقوش لگائے۔ تبادلۂ خیالات آپس میں حوصلہ افزائی اور ماحول لکھنے کے لئے ضروری ہے۔ لیکن گھٹیا قسم کی لطیفے بازی، نوک جھونک کسی کا کچھ نہیں سنوارتی۔

"کبھی اُداس بھی ہوئی ہو؟"

"اُداس جیسی اُداس۔ پانچ دفعہ تو اپنے آپ کو ختم کرنے کی کوشش کی۔ جو زہر ملا، کھایا، مگر مجھے ہوتا ہی نہیں کچھ۔"

"تمہارا پبلشروں کے ساتھ کیسا ہے؟"

"کوئی تکلیف نہیں۔ کسی پرچے نے کبھی میری کوئی تخلیق واپس نہیں کی۔ کتابیں شائع کرنے والے پیسے بھی دیتے ہیں۔ ویسے بھی میں میڈیا کے ساتھ بگاڑنے کے حق میں نہیں۔"

"کیا تمہارے اس مقام میں کہیں اسی بات کا ہاتھ تو نہیں؟"

"نہیں، مجھے کون پوچھتا ہے۔ آج کے زمانے میں گھر بیٹھنے والے کو پوچھے گا بھی کون؟ ایلیٹس (ELITES) کا ایک سرکل ہر جگہ اور ہر ملک میں ہوتا ہے۔ پیرس میں پکاسو اور بارک نے اکٹھے کیوبزم شروع کئے۔ بلکہ بارک اس کا سرکردہ تھا۔

لیکن پکاسو چلنے پھرنے والا تھا، ملنسار۔ اسی لئے آج سب پکاسو کو ہی جانتے ہیں۔ بارک کا کوئی نام بھی نہیں لیتا۔'

'کیا تمہارا مقام اس لئے بھی بنا ہے، کہ تم عورت ہو؟ خوبصورت عورتوں کا جادو ہر سماج میں چلتا ہے۔ اور تم عورت بھی بے باک ہو۔ ادیبہ ہونے کی وجہ سے جذباتی بھی۔ پنجاب کی اور فنکار عورتوں کے بارے بہت کچھ سننے میں آتا ہے۔'

'میرے خیال میں نہیں۔ کچھ حالتوں میں ہو بھی سکتا ہوگا، لیکن وہ تعرر مستحکم نہیں ہوتا۔ اصل قیمت تو تحریر کی ہی پڑتی ہے۔ عورت تو حسن گنوا بھی سکتی ہے۔ عمر کے ساتھ دلکش بھی نہیں رہتی، لیکن تحریر اپنا جادو نہیں گنواتی۔'

'تمہاری روزمرہ کی زندگی کیسے گزرتی ہے'؟

'جو دل کیا کر لیا، جدھر دل آیا، چل دی۔ پڑھنے کے لئے مجھے جو کتاب اچھی ملے، ضرور پڑھتی ہوں۔ دہلی میں کوئی ناٹک اور فلم نہیں چھوڑتی۔ لندن یا اور کہیں جاتی ہوں، تب بھی فلموں اور ناٹکوں میں مصروف۔ میرے لئے یہ مصروفیت ہی ایک طرح کی تسکین ہے۔ ان کی اندرونی محبت، اپنائیت، میرے اپنے ساتھ مشترک، عام سماجی رویئے سے بالکل مختلف ہے۔'

'اجیت، فالتو عورت بارے دلیری کے ساتھ لکھ کر تم نے درمیانی طبقہ کے مردوں کی عیاشی کی عکاسی کی ہے۔ لیکن کیا تمہارے اپنے عشق بھی تمہیں عام قارئین کی نظروں میں ایک عیاش اور بدمعاش عورت بنا کر نہیں رکھ دیتے'؟

'نہیں، عشق اور فالتو عورت رکھنا، اور اس کو مرضی کے مطابق استعمال کرنا دو مختلف باتیں ہیں۔ ہمارے سماج میں کوئی عورت فالتو مرد نہیں رکھ سکتی۔ عورت کچلی ہوئی ہے، پسی ہوئی۔ میں نے فالتو عورت کا درد اور احساس آگے لا کر بات کی ہے برابری کی۔'

'تمہارے خیال کے مطابق کیا مغربی عورتوں کو برابری ملی ہے'؟

'ہاں، کاغذات میں تو کافی مل گئی ہے۔ جب نوکریاں ملتی ہیں، تو برابری۔ لیکن جب آگے ترقی کا معاملہ آتا ہے، تو پھر مردوں کی باری۔ سارا سوال ڈھانچے کا ہے۔ مرد اب بھی قابض ہیں۔'

'مغربی ممالک میں آکر کیسی پنجابنوں میں سے زیادہ مردوں پر حاوی ہو رہی معلوم ہوتی ہیں۔ نہیں'؟

'شاید یہ ٹھیک ہو۔ آزادی ملنے کی وجہ سے ان کے اوور شوٹ کر جانے کا بھی معاملہ ہے۔ کنبے کی اکائی بھی مغربی ممالک میں ٹوٹتی ہے۔ تہذیب کا ٹکراؤ بھی ہوتا ہے۔'

'تمہارے عشقوں کا چرچا بھی عام ہے'!

'مجھے آج کل کسی کے ساتھ عشق نہیں۔ ویسے عشق کوئی رُت وغیرہ نہیں ہوتا۔ دو فرد کہیں ویولینگتھ پر ہی ملتے ہیں، اور یہ روز روز نہیں ہوتا۔ جب جادو ہو جائے، تو زندگی حسین معلوم ہونے لگتی ہے۔ سب کچھ انوکھا، رنگین۔ خود ہی یہ رنگت اُڑ جاتی ہے۔ کسی اور رنگت نے نہ معلوم کب آنا ہے۔'

ہمارے سماج میں بھی اور ادب میں بھی مردوں کی یاری کا بہت ذکر ہے — مردوں کی مردوں کے ساتھ یاری کا۔ کبھی کسی کو عورتوں کی یاری کا بھی ذکر کرتے دیکھا ہے، سہیلی بننے کا۔ مرد ہی کی بات پردھان ہے۔ اس کے جذبات اور کارناموں کا ذکر بھی۔ کئی بار سوچتی ہوں، کہ شہروں کی عورتیں زیادہ تنہا، زیادہ دکھ، زیادہ ذہنی اذیت برداشت کرتی ہیں۔ گاؤں کی عورت اڑوس پڑوس سے ملتی ہے۔ دکھ بانٹ لیتی ہے۔ چاہے اُوپر سے لگتا یہی ہے، کہ اس کا ان پڑھ اور کم تہذیب یافتہ مرد زیادہ دباؤ رکھتا ہوگا۔ بے دردی سے مارتا پیٹتا بھی ہوگا۔

'تم نے اپنی آپ بیتی کا نام 'خانہ بدوش' کیوں رکھا'؟

'میں ہوں ہی خانہ بدوش! یہی ایک لفظ ہے، جو میرے حالات کو بھی، اور

میری طبیعت کو بھی ریپریزنٹ کرتا ہے۔ پہلے بے ٹھکانہ جینے کا بہت ڈر رہتا تھا۔ بعد میں طبیعت ہی سالی خانہ بدوش ہو گئی۔ ویسے بھی نہ پیسے جمع کر سکتی ہوں، نہ صراطِ مستقیم زندگی بسر کر کے گھر بنا سکتی ہوں۔ مجھے خطرات اچھے لگتے ہیں۔ ڈرِفٹ تو ڈرِفٹ ہی سہی۔ مگر ایک بات ہے، خانہ بدوش ضرور ہوں، ویگا بانڈ نہیں۔ یہ فرق سمجھنے کی ضرورت ہے۔'

'ہرجائی! بے وفا!'

'موجودہ دور میں نہیں۔ مجھے بھی بہت چیزوں سے لگاؤ ہوتا ہے، اور ٹوٹتا ہے۔ مگر اپنے جذبوں کی سچائی کے ساتھ، انسان کی مکمل آزادی کے ساتھ بندھی ہوئی ہوں۔ اس کے کھوکھلے اصولوں سے باغی ہوں۔'

'نومبر ۱۹۸۴ء کے دہلی کے قتل عام کے وقت تم کہاں تھیں۔ کوئی احساس، کوئی سوچ!'

'آپ اور ہم سب یہ چاہتے ہیں، کہ دہلی تو کیا، کہیں بھی من چوراسی کا قتلِ عام نہ دہرایا جائے۔ مذہبی جنون کے خلاف ہوں۔ لیکن جاننے والی بات یہ قتل کرتا کرواتا کون ہے۔ قتل بھیانک ہیں، خون کی ندیاں، لیکن یہ کس وجہ سے ہو گئے۔ دہلی میں خاص کر کے، اور پنجاب سے باہر بیٹھے سکھوں میں عموماً اتنا سہم ہے، کر رہے رب کا نام۔ مگر کہاں جائیں گے۔ میں قتل عام سے کچھ دن بعد ہی ایک سکھ کو ایک سڑک کے کنارے کھلکھلا کر ہنستے دیکھا۔ سوچا، ہیں، یہ ابھی ہنس رہا ہے۔'

'تمہارا مضمون 'لہو کے چرچے'، بہت اچھا تھا۔ پنجاب اور سکھ من کے درد بارے اس سے بڑھیا تحریر اور کوئی نہیں ہو سکتی۔'

'لہو کے چرچے، ان حقائق پر مبنی ہے، جو سن چوراسی کے ملٹری ایکشن کے وقت سامنے آئے تھے۔ جو کچھ ہوا تھا، اس پر دل بڑا دکھی تھا۔ کئی خط بھی آئے، مگر سوچا، کہ اس دکھ کا مطلب یہ تو نہیں، کہ ہم کوئی علیحدہ ملک مانگنے بیٹھ جائیں۔ رہیں گے ہم

تو بھارت میں ہی، لیکن ان زیادتیوں کی پُرزور مخالفت کریں گے، جو کہیں بھی کسی کے ساتھ ہو۔ ملک میں رہ کر اپنا حق مانگنے اور ہر مظلوم کے حق کے لئے لڑنا زیادہ عظیم بات ہے۔ ڈیرلیٹمنٹ کی علیحدہ مسجد بنانے کا سپنا لینا، اور شور مچائے جانا گھٹیا بات ہے۔

"پنجاب مسئلے کا کوئی حل بھی ہے؟"

"ہاں، ہے۔ اگر ایمانداری سے کیا جائے۔ اگر ووٹ نے کر کرسی قایم رکھنے کے لئے لوگوں کے جذبات سے کھیل جاری رہا، تو خون بہتا ہی رہے گا۔ زخم ابھی تک گہرا ہی ہوتا گیا ہے، مندمل ہونے کے لئے اتنی ہی دیر لگے گی۔ پنجاب بارے میں خشونت کی طرح سوچتی ہوں۔ جہاں سے آگ کی لاٹ شروع ہوئی، اس کے خلاف لڑو۔ لیکن اس کا مطلب گھر کے ٹکڑے کر لینا نہیں۔"

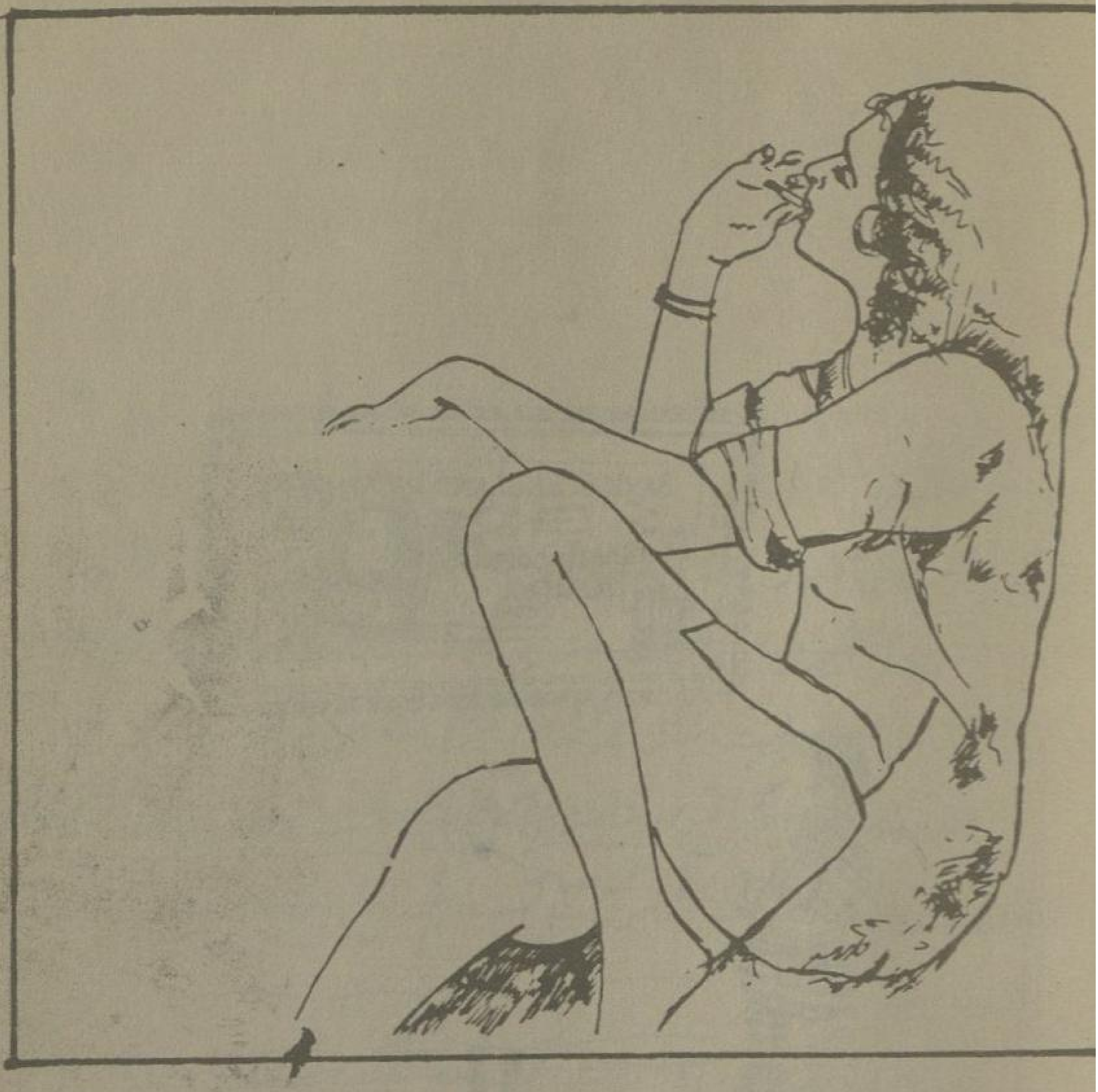
اب ہم کافی باتیں کر چکے تھے۔ درختوں کے سائے لمبے ہو گئے تھے، اور پہلے سے شو کا بھی وقت ہو گیا تھا۔ سوچا، باقی کی باتیں کسی اور وقت سہی۔

پہلے کی کہانی بھی ایک ایسی عورت کے متعلق تھی۔ جس نے بیوہ ہو جانے کے بعد گاؤں کے دقیانوسی اور مذہبی ماحول کے خلاف بغاوت کرنے کے لئے انوکھے بتوں کی تخلیق کی تھی۔ یہ راستہ تھا، اس کے لئے خود تکمیل کا، آزادی کا، نجات کا۔

"آج بہت اچھی شام رہی۔" باہر نکل کر میں نے کہا۔

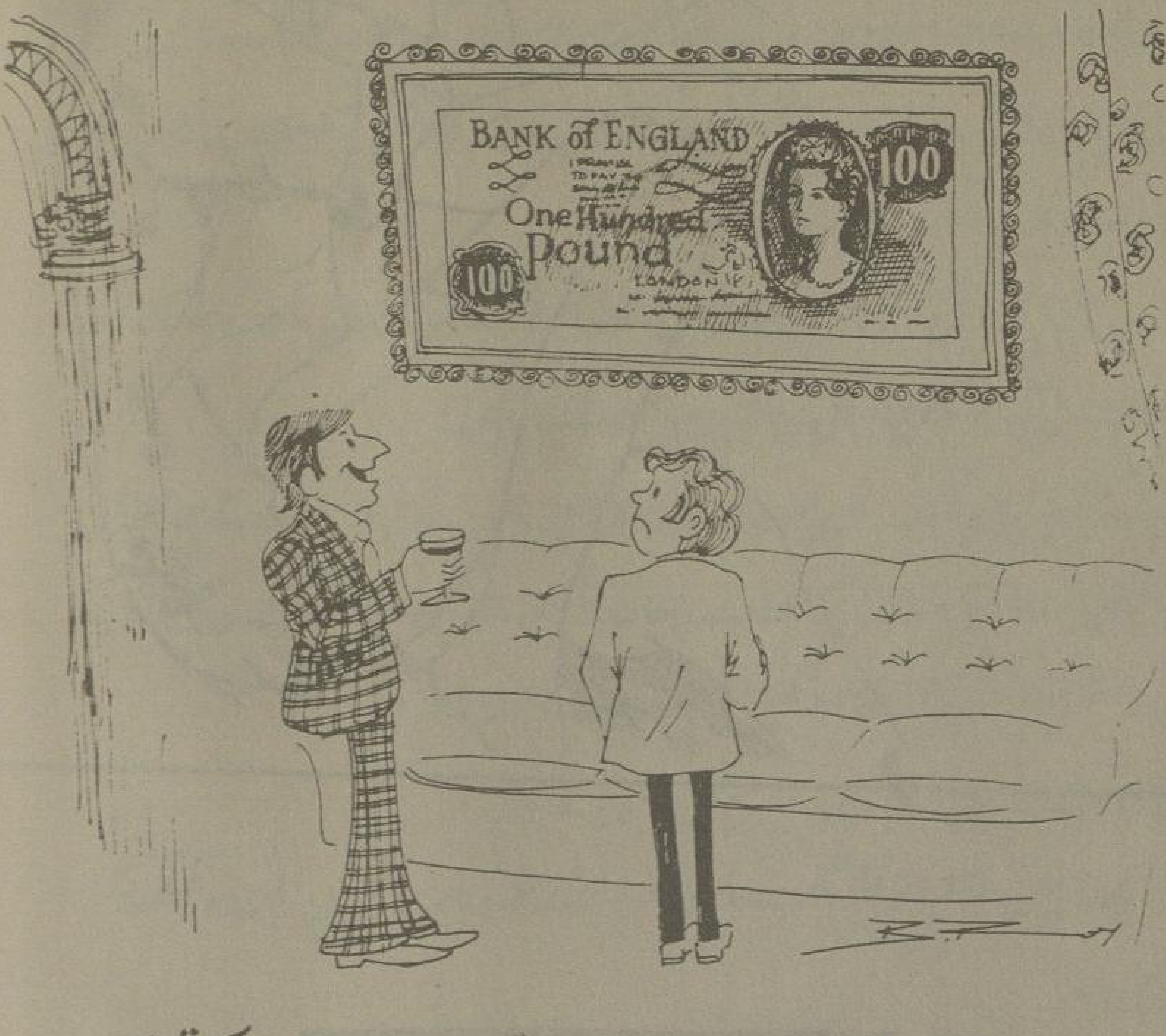
"دیکھا، میں نے کہا تھا، کہ گھر سے باہر نکلو، توڑو کاروباری زنجیریں۔" اور وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

اس کی ہنسی میں گھنگھروں کی جھنکار کی آواز تھی۔ اس کا چھوٹا سا قد مجھے بڑا بڑا لگنے لگا۔



کچّے رنگوں کا شہر

لندن



"مجھے پونڈوں ہی سے پیار ہے۔ اسی لیئے بیوی کی تصویر
کی بجائے میں نے پونڈ کی فوٹو ہی فریم میں جڑوا رکھی ہے۔"

لندن!

لندن کی گلیاں اور سڑکیں۔

لندن کی گلیوں میں گھومتے، لندن میں رہنے والے دوستوں اور غیر دوستوں کو ملتے ہوئے احساسات سان پر چڑھ کر تیز ہوتے ہیں۔

ہمارے ساتھ ہر نیا تجربہ شائد یہی کرتا ہے، لیکن لندن میں ان تیز ہوئے احساسات کے ساتھ آپ زندگی کے ایک پہلو کے رُوبرُو ہوتے ہیں، زندگی کے ساتھ مقابلہ۔

اور بڑی نئی سوچوں کا جھرمٹ آپ کے ارد گرد جمع ہو جاتا ہے۔ مثلاً: کہ بھول میں کتنی طاقت ہوتی ہے، اور یہ کہ سائے اصل چیز سے بھی زیادہ قیمتی ہو سکتے ہیں، اور یہ کہ روٹی کا مسئلہ سب سے بڑا مسئلہ ہے، اور یہ کہ ملک کی محبت اور بندوں کی محبت، اور خون کے رشتے، اور دوستوں کے رشتے، سب جھوٹ۔ سچ صرف زندہ رہنے کی حقیقت۔ اور یہ کہ بندہ زیرو سے شروع کر کے صرف اپنی ہڈیوں کی مزدوری کے ساتھ اور صرف سخت محنت سے زندگی کی تعمیر کر سکتا ہے۔

لندن کی زندگی!

سوموار صبح سے لے کر جمعہ کی شام تک کا اندھا بہرہ سفر، لگاتار دوڑ۔ بستر سے نکلنے اور گھر سے نکلنے کے درمیان صرف پانچ منٹ کا فاصلہ! ہڑبڑاہٹ! منہ پر پانی کا چھینٹا۔ الیکٹرک شیور یا لپ سٹک کا تیزی سے لیپ۔ بریک فاسٹ؟ یہ تو صرف ٹورسٹ کھاتے ہیں، یا ہوٹلوں میں ٹھہرے ہوئے بزنس مین۔

سارا دن کام! ہندوستان کی طرح نہیں۔ جہاں آٹھ دفعہ بابو چائے پینے کے لئے غائب ہوتا ہے، اور سولہ دفعہ پان کھانے کے لیئے، اور بتیس دفعہ ٹیلیفون سننے کے لیئے۔ جہاں یہ کہہ کر دوست دفتر میں ہی آدھمکتا ہے "ادھر سے گزر رہا تھا، سوچا، ہیلو کر چلیں"، اور بابو چپڑاسی کو دو سپیشل چائے کا آرڈر دے کر گپیں ہانکتا رہتا ہے۔

شام! بزنس والے لوگ بزنس ڈنر کھاتے ہیں۔ ہندوستانی مرد پب (شراب خانہ) میں جاتا ہے، اور عورتیں روٹیاں پکاتیں اور بچوں پر غصّہ نکالتی ہیں۔ انگریز اگر شادی شدہ ہو، تو یا تو ٹیلی وژن دیکھتا ہے، اور یا پب میں چلا جاتا ہے، اور اگر شادی شدہ نہ ہو، تو محبوبہ کے پاس۔

شام! جو غروب ہوتے ہوتے سات نخرے کرتی ہے۔ رات کے دس بجے تک آسمان ملائم روشنی سے لیپا رہتا ہے۔ نیم مدہوش سا، نیم سیلٹی۔

انگریز آج تک فاک لینڈ کی جیت کے نشے میں مخمور ہیں۔ ہزاروں میل دُور ایک چھوٹے سے جزیرے کو مار مار کر اپنے قبضہ میں رکھنے کے لیئے سینکڑوں ماؤں کے بیٹے مروا کر، اور لاکھوں پونڈ کے جہازوں کا نقصان کروا کر آخر ہی فتح کی خوشی میں بھنگڑے ڈال رہے ہیں۔ ہر اسٹیشن پر فاک لینڈ کی جیت کے بارے میں گورنمنٹ کی طرف سے شائع پمفلٹ اور کتابیں رکھی ہوئی ہیں۔ اٹھاؤ، پڑھو اور

گاڑی میں لے جاؤ۔ پڑھنے کو نہ دل کرے، تو ان سے پنکھا جھیلیں۔ اور گھر آتے راستے میں کوڑے کے ڈرم میں پھینک آؤ۔ کیونکہ گھر کا کوڑا کیوں بڑھانا؟ میونسپلٹی والے تو ہفتہ میں صرف ایک دفعہ کوڑے کے بڑے لفافے اُٹھانے آتے ہیں۔

اور بیروت، جو جل رہا ہے، اُس کے بارے میں آپ کیا سوچتے ہیں؟

ہاں بیروت! بیرو..... ت! بڑی بُری بات ہے۔ اسرائیل کو ایسے نہیں کرنا چاہیئے۔ بے چارے سویلین! انگلینڈ اس کے بارے میں کیا کر رہا ہے؟ انگلینڈ بھلا کیا کر سکتا ہے۔ سوائے اس کے کہ یو این او میں ہماری اور اپنی اکانومی، یو نو، بڑے کرائیسس میں سے گزر رہی ہے۔ وہاں ہزاروں زخمی بچے، عورتیں مر رہی ہیں، تڑپ رہے ہیں۔ دوائیں نہیں۔ کچھ فنڈ آپ بھیج رہے ہیں؟ فنڈ؟ فنڈ جو ہم آجکل فاک لینڈ کے اُجڑے لوگوں کے لیئے اکٹھا کر رہے ہیں! اب ہم کتنے فنڈ اکٹھے کرتے جائیں؟ ہاں، خیر بیروت کے لیئے بھی.....

انگریز قوم بڑی مہذب قوم ہے۔ مجلسی۔ کسی بات کو دو ٹوک انکار نہیں کر دیتے۔ خاص کر جب دوسرے کی بات نہ ماننی ہو، تو کہیں گے، "لیس ایبٹ....." سارا راز اسی بٹ میں ہے۔

اتوار کو ہائیڈ پارک میں لوگ اپنے اپنے مجمعے جما کر کھڑے ہیں۔ لوگوں کی چھوٹی چھوٹی ٹکڑیاں ہر بولنے والے کے گرد کھڑی ہیں۔ ان میں سے ایک 'کالا' چہرہ میں پہچانتی ہوں۔ وہ گزشتہ پانچ برسوں سے ہر اتوار کو ہائیڈ پارک میں ہی تقریباً اُسی ہی جگہ پر میز پر کھڑا تقریر کر رہا ہوتا ہے۔ بالکل کوری تقریر بھی نہیں۔ بیچ بیچ سننے والے باتیں بھی کرنے لگتے ہیں۔ تقریباً آدھا گھنٹہ وہ لوگوں کی باتوں کا جواب بھی دیتا رہتا ہے۔ میں سوچتی ہوں، خدا کا شکر ہے، اس مرتبہ وہ

ہر سال کی طرح اپنی باتیں دُہرا نہیں رہا۔ تب ہی وہ کہتا ہے، "افریکہ! افریکہ کو تو ساری دُنیا مدد دے رہی ہے۔ انگریز وہاں بیٹھے ہیں۔ کہتے ہیں، ہم افریکہ کی مدد کر رہے ہیں۔ فرانسیسی ہیں، جرمن ہیں، آپ کسی بھی بڑی طاقت کا نام لیں، وہ وہاں موجود ہیں۔ کیوں او بھائی آپ یہاں؟ اپنے گھر جاؤ، کیوں بیٹھے ہو افریکہ میں؟ ہم کو اپنے حال پر چھوڑ دیں، ہم کو اپنے طریقے سے جینے دیں۔ کہتے ہیں، نہیں، ہم یہاں تمہاری مدد کرنے بیٹھے ہیں۔ لو! اب میں یہاں ہوں، افریکہ کی طرح! یہاں کرو میری مدد! نہیں! یہاں تو مجھے کوڑا سمجھا جاتا ہے۔ آپ بے چارے ہزاروں میل دور جو میری مدد کرنے جاتے ہیں، تو یہاں میری مدد کیوں نہیں کرتے؟ جب کہ میں تمہاری آنکھوں کے سامنے بیٹھا ہوں؟" لوگ ہنستے ہیں۔ وہ میز پر کھڑا جھومتا ہے، اپنے گول موٹے ہونٹ ذرا سے ترچھے کر کے مسکراتا ہے۔

دُوسرا مجمع! ایک اور کالا آدمی، دُودھ کی بوتلیں رکھنے کے لئے پلاسٹک کے بکس کو اُلٹا کر کے اس پر کھڑا ہے۔ کہہ رہا ہے، "دُنیا کی تمام پراسٹیچوٹ زندہ باد۔ اگر پراسٹیچوٹ نہ ہوں، تو دُنیا کے آدھے لوگ پاگل خانے میں ہوں، اور آدھے ہوموسیکوئیل ہو جائیں۔ ویسے تو ہوموسیکوئیلیٹی کوئی بڑی بات نہیں۔ کیونکہ تمام دُنیا کے تمام آلیٹیز ین۔ دے آر ڈوئنگ میوچل ماسٹر بیشن آل دی ٹائم، آل اوور دِس بلڈی شٹ آف اے ورلڈ۔"

تیسرا مجمع! ایک اسرائیلی، جو شاید سٹوڈنٹ معلوم ہوتا ہے، بہت اُونچی آواز میں بہت غصّے میں بول رہا ہے، "تم آج اسرائیل کو گالیاں دے رہے ہو عرب نسٹرر! کیمپوں میں رکھ کر ذبح کیا جاتا تھا، جب جُونے کے گڑھوں میں ڈال کر اُن کے جسموں کی کھاد بنا دی جاتی تھی؟ جب گیس چیمبرز میں ہزاروں لوگوں کا ایک دم صفایا کر دیا جاتا تھا؟ آج فلسطین کی ہوم لینڈ کے لئے آواز بلند کرتے ہو؟" اور بھیڑ میں

کھڑے عرب سٹوڈنٹ خاموشی سے سُن رہے ہیں۔ لیکن کچھ عرب سٹوڈنٹ شور مچا دیتے ہیں۔ تُو تُو، مَیں مَیں، شور، ہنگامہ، کسی کی بات سمجھ میں نہیں آ رہی۔ صرف غصّے میں سُرخ ہوتے چہرے، تنے ہوئے مَسل اور شور! تب ہی چار سپاہی آتے ہیں، کالی وردی، کالی ہیلمٹ، فوجی جرنیلوں کی طرح چُست اور سمارٹ! آہستہ آہستہ بھیڑ کو ہٹانے لگتے ہیں۔

آکسفورڈ سٹریٹ کے ایک چھوٹے سینما ہال میں فلم "جرمن سسٹرز"۔ دو بہنیں۔ ایک انقلابی ہے۔ دُنیا کا اصُول بدلنا چاہتی ہے۔ کسی ٹوررسٹ گروپ میں ہے۔ اپنے دو ہی سال کے بچّے کو اپنے خاوند کے پاس چھوڑ کر گھر سے نکل گئی ہے۔ انڈر گراونڈ ہو گئی ہے۔ خاوند نوکری چھوڑ کر بیٹے کی پرورش کرتا ہے۔ فاقوں کی حالت میں بیٹے کو لے کر سالی کے پاس جاتا ہے۔ "میں آسٹریلیا جا رہا ہوں، تم اس کو رکھو۔" بیٹے کو سالی کے پاس چھوڑ کر وُہ واپس جا کر اپنے سَر میں گولی مار لیتا ہے۔ مگر بہن کی اپنی زندگی ہے۔ جس آرکیٹیکٹ کے ساتھ وُہ رہ رہی ہے، گذشتہ دس سال سے اس کے ساتھ شادی اس لئے نہیں کی، کیونکہ اس کو بچّے پسند نہیں۔

لڑکے کو کِسی گاؤں میں کیئر ٹیکرز کے پاس چھوڑ آتی ہے۔ بہن گرفتار ہو جاتی ہے۔ جیل میں اس کو ملنے جاتی ہے۔ وُہ اپنے بیٹے کے بارے میں پُوچھتی ہے۔ بہن کہتی ہے، "تم کو اس کے ساتھ کیا؟ تم تو دنیا کو بدلو۔ سرکار بدلو۔ انقلاب لاؤ۔ بیٹے کو، کُوڑے میں پھینک کر لوگوں کی زندگی بدلو۔" پھر وُہ آہستہ آہستہ اپنے بچپن کی باتیں کرتی ہیں۔ لمبی باتیں نہیں، بس ایک آدھ ٹچ، اور یہ ٹچ دونوں کو جوڑتا ہے۔ آخر میں کوئی دو تین سال کے بعد جیل کی اذیتیں برداشت کر کے وُہ خود کشی کر کے مر جاتی ہے۔ بہن کو علم ہے، کہ اس طرح کی لڑکی خودکشی نہیں کر سکتی تھی، ضرور

اُس کو جیل میں اذیتیں دے کر مار دیا گیا ہے، اور خودکشی کہہ دیا گیا ہے۔ بعد میں اُس کی زندگی کا ایک ہی مقصد رہ جاتا ہے، اس بات کو ثابت کرنا، کہ اُس کو قتل کیا گیا ہے، اُس نے خودکشی نہیں کی۔ ثبوت ڈھونڈنے میں آٹھ دس لگ گئے۔ محبوب آرٹسٹ اس کو چھوڑ کر چلا گیا۔ آخر کار ثبوت مل گئے۔ مگر اب وُہ کوئی مقدمہ دائر کرنے کے لیئے تیار نہیں۔ اخبار کا ایڈیٹر کہتا ہے "دس سال پُرانی بات کی کیا اہمیت رہ گئی ہے! آج تو نیوکلیئر ویپنز کی، اور مڈل ایسٹ کی لڑائی کی، اور پیٹرول کی بڑھتی ہُوئی قیمتوں کی اہمیت ہے۔ اور آخری سین میں اُس مر گئی بہن کا بیٹا اپنی ماں کی تصویر کو پھاڑ رہا ہے، خالہ کے گھر میں۔ اور کہہ رہا ہے "آئی ہیٹ ہر۔ میرے سب دوست کہتے ہیں، بم پھینکی تھی"۔

ساری فلم کے ڈائیلاگ بمشکل دو صفحات میں لکھے گئے ہوں گے۔

رات کو آئیونیسکو کا ڈرامہ پڑھ رہی تھی۔ ایک کردار کہتا ہے "ورڈز گین ان سگنی فیکنس ایز دے لوز ان میننگ"۔

آج کل جس عورت کے پاس ہم رہ رہے ہیں، وُہ فرانسس ٹیوٹن سوزا کی پہلی بیوی ماریہ سوزا ہے۔ سوزا نے اس کے بعد تین شادیاں کی ہیں، اور بیس عورتوں کے ساتھ شادی کے بغیر ہی رہ چُکا ہے۔ لیکن یہ عورت ماریہ، جو گوا میں پیدا ہُوئی تھی، ابھی تک اپنے تن کو اور اپنے نام کو سوزا کے ساتھ جوڑے بیٹھی ہے۔ بے حد تنہا۔ چار بلیوں کے ساتھ رہتی ہے، اور کپڑے سیتی ہے۔ اس کو کپڑے سینے اور اپنے پروفیشن پر بڑا فخر ہے۔ اپنے آپ کو "دَن آف دی بیسٹ کوٹوریئر" کہتی ہے۔ ایک لڑکی ہے۔ براڈوے تھیٹر نیویارک میں ایکٹنگ کے

لیٹے گئی ہے۔ مگر ابھی سٹرگل کر رہی ہے۔ اور اس تیس بتیس سال کی لڑکی کو بھی وہی پیسے بھیجتی ہے۔ اور سوزا کے پاس بھی جب پیسے نہ ہوں، فاقوں کی نوبت ہو، اور ماریہ کو پتہ لگ جائے، تو اس کو بھی پیسے بھیج دیتی ہے۔ جب وہ بہت بیمار ہو جائے، کیونکہ اس کے جگر میں تپدق ہے، ہسپتال چلی جاتی ہے، اور بلیوں کا فکر کرتی رہتی ہے۔ بتیس سال انگلینڈ میں رہنے کے باوجود اس کے من کی بناوٹ میں ہندوستان کی جو مٹی لگی ہے، وہی اس کی طاقت ہے، اور وہی اس کی تباہی کا باعث!

اس دفعہ سوزا ہندوستان کو جاتے ہوئے، اور ہندوستان سے واپس آتے ہوئے اس کے پاس تین ہفتے رہا تھا۔ پہلے پانچ سات سال پہلے ماریا نے ایک آرٹ گیلری چلائی تھی۔ آج کل آرٹ گیلری بند ہے۔ اور اس خالی کمرے میں اس نے سوزا کے لئے گدا بچھا دیا تھا۔ اسی گدے پر میں اور امریتا سوتی ہیں۔ لیکن فخر اس بات کا نہیں، کہ سوزا اس گدے پر سویا کرتا تھا، عظیم چترکار سوزا۔ فخر اس بات کا ہے، کہ یہ بڑے سینے والی اور چار بلیوں کو پیار کر کے گہری تنہائی کو جھیلنے والی ماریہ کا گھر ہے۔

ویسے یہاں کئی بزرگ عورتیں اور مرد اکیلے رہتے ہیں، یا اکیلے گھروں میں رہتے ہیں، یا بوڑھوں کے ہومز میں۔ اکیلے گھر میں جب کوئی مر جاتا ہے، تو پتہ کس طرح لگتا ہے؟ میں پوچھتی ہوں۔ سمپل! باہر دروازے پر پڑی دودھ کی بوتل جب اگلی سویر تک بھی پڑی ہو، تو دودھ والا پولیس کو خبر کر دیتا ہے۔ ہاں، واقعی، بالکل سمپل! یہ تو مجھے سوجھا ہی نہیں تھا، کہ یہ بات اتنی سمپل ہے۔

ٹریفالگر سکوائر میں بچے کبوتروں کو دانہ ڈال رہے ہیں۔ ان میں سے بہت سارے بچے ایسے ہوں گے، جو بے حد اکیلے ہیں۔ ماں کام پر، باپ کام پر، اور

بچے کبوتروں کو دانہ کھلا رہے ہیں۔

جوان لڑکے لڑکیاں کبوتروں میں گھرے پیار کر رہے ہیں۔ مگر کوئی ان کی طرف نہیں دیکھتا۔ انسانوں اور کبوتروں اور کالے بتوں کی بھیڑ میں وہ اپنے چھوٹے چھوٹے جنزیرے بنا کر کھڑے ہیں، بیٹھے ہیں، یا لیٹ کر اور پیار کر رہے ہیں۔

انڈین فیسٹیول؟ ہاں، جب شروع ہوا تھا، اندرا گاندھی آئی تھی، اور سبّو لکشمی نے گایا تھا۔ اخباروں میں تصویریں شایع ہوئی تھیں، اور مارگریٹ تھیچر اور اندرا گاندھی کے انٹرویو۔

اُس کے بعد؟ اس کے بعد تو پتہ نہیں، کہ کیا ہو رہا ہے۔ بار بیکن میں آرتی کا شو ہے۔ گاؤں کے لوگ فنکاریاں نکالتے ہیں، ناچتے ہیں، گاتے ہیں، اور سپیرا ہے۔ دو پونڈ کا ٹکٹ ہے۔ ہم تو گئے نہیں۔ ہاں سکولوں کے بچے جاتے ہیں۔ مگر بھئی اس میلے پر تو لاکھوں کروڑں روپے خرچ ہو رہے ہیں۔ ہوتے ہی رہتے ہیں سرکاروں کو کیا فرق پڑتا ہے؟

انڈیا ہاؤس میں کوئی آدمی نہیں ملتا۔ سب بہت مصروف ہیں۔ انڈیا فیسٹیول جو ہے! روز تو ہندوستان سے سینکڑوں لوگ آتے رہتے ہیں، فیسٹول کے لیئے۔ پارلیمنٹ کے ممبر، منسٹر، افسر! اُن کو ائیرپورٹ سے لینے جانا، ہوٹلوں میں ٹھہرانا، سیر کرانا، فیسٹول دکھانا، شاپنگ کرانی۔ آج کل بھی شیلا کول آئی ہوئی ہے۔ منسٹر! چیف جسٹس بھی یہاں ہے۔ جے۔ پی داس بھی آیا ہوا تھا، ابھی ابھی گیا ہے۔ لیکن ہندوستان سے کیوں اتنے لوگ آتے ہیں، ہندوستان کا میلہ دیکھنے؟ یہ میلہ تو یہاں کے لوگوں کے دیکھنے کے لیئے لگایا گیا تھا ناں!

اچھا موقع ہے۔ مفت ہوٹل، مفت ٹکٹ!

- مُفت؟

- ہاں، یعنی ائیر انڈیا مُفت لے آتی ہے، اور ہوٹل کے بِل ہندوستان کی سرکار دیتی ہے۔

گوتم دھرمیندر کہتا ہے، پچھلے سال ہم نے سوچا، یہاں کیوں نہ ہندی کانفرنس کی جائے؟ پنجابی کانفرنس اگر ہو سکتی ہے، تو ہندی کانفرنس کیوں نہیں؟

میں حامی بھرتی ہوں۔

پنجابی کانفرنس تو بہت کامیاب رہی۔

اچھا؟

ہاں۔ کیوں؟ آپ کو شک ہے؟

نہیں، شک کیوں ہونا ہے۔ ویسے میں سوچتی ہوں، کہ جس کانفرنس میں، امرتا پریتم کو نہیں بلایا گیا، خشونت کو نہیں بلایا گیا، بلونت گارگی کو نہیں بلایا گیا، وہ کیسی کانفرنس ہوئی؟

مگر سیکھوں آیا تھا، کنول آیا تھا۔

کئی لوگ سائیکلوسٹائیلڈ چٹھیوں کے ساتھ آجاتے ہیں۔ کئی ایک کا اندازِ حیات ذرا اور ہوتا ہے۔ ہاں آپ ہندی کانفرنس کی بات کریں۔

ہاں، ڈاکٹر آئی۔پی۔ سنگھ یہاں تھے نا ہائی کمشنر؟ اُن کی بیوی آشا سنگھ ہندی کانفرنس کی پریذیڈنٹ تھی۔ اُنہوں نے کہا تھا، ائیر انڈیا سے مُفت بھیج لے دیں گے، سارے مصنفوں کے لیئے، اور پیسے یہاں برٹش سرکار کافی دے دیتی ہے۔

پنجابی کانفرنس والوں کو بھی دیئے تھے۔ پھر؟

پھر میں دسمبر میں وارسا گیا۔ وہاں ہندی کانفرنس ہو رہی تھی۔ اُن بتایا۔ مشورہ

کر۔ نے ہی گیا تھا۔ وہاں دیکھا، بہت گروپ ہیں۔ ہر گروپ کہے، ہمارے آدمی ہی انوائیٹ کرو۔ میں تو واپس دوڑ آیا۔ مہادیوی ورما کو پریزائیڈ کرنے کے لئے بُلایا ہُوا تھا۔ اس لئے اُن کو جاکر بتایا۔ اُنہوں نے کہا، چھوڑیں، مٹی ڈالیں۔ اس طرح کے، ایک دُوسرے کے دشمن گروپوں سے ہم نے کیا لینا۔

اچھا کیا۔ کانفرنسوں میں کیا پڑا ہے۔ بیٹھ کر لکھو۔ کری ایٹو کام کرو۔

کچھ دن پہلے ٹیلیویژن پر خشونت کا انٹرویو تھا۔ بڑی چرچا ہے اس کی۔ لوگ اس پر فدا تھے۔ پھر دس دن ہوئے، ایک پروگرام تھا پنجابیز ان بریٹن، اس میں پھر خشونت سنگھ کے ساتھ تقریباً دو منٹ کا انٹرویو تھا۔ کمبخت دو باتیں کرتا ہے، کلیجے میں اُتر جاتا ہے۔ کہنے لگا، "میرا ایموشنل ہوم بریٹن ہے"۔

ساؤتھ ہال میں عورتیں اُسی طرح سُتھناں جھگے پہن کر سبزی بھاجی خرید رہی ہیں۔ اچار اور مُربے خرید رہی ہیں۔ گہنے بنوا رہی ہیں، تُڑوا رہی ہیں۔ رنگ برنگے جاپانی کپڑے خرید رہی ہیں۔ گول گپے اور سموسے کھا رہی ہیں۔

اس سال کا بیسٹ بزنس مین کا کوئینز ایوارڈ ایک پنجابی بیوپاری کو مِلا ہے۔ کسی بھی پنجابی بیوپاری کے ساتھ بات کرو، اس کو اس بات کا بڑا فخر ہے۔ "گوروں کا بس تھلّا لگایا ہُوا ہے یہاں اپنے لوگوں نے۔ ایک ایک فیکٹری میں، ایک ایک ویئر ہاؤس میں پچاس پچاس، سو سو گورے کام کرتے ہیں اپنے لوگوں کی نوکری میں۔ ان حرامیوں نے جو راج کیا ہے ہم پر، ہم اس کا بدلہ لے رہے ہیں۔ گوریوں سے جھاڑو لگواتے ہیں، اور گوروں سے بوجھ اُٹھواتے ہیں۔

گوستاو ڈیلینگو اور اُس کی بیوی بڑے خوبصورت اور لمبے چوڑے بنگلے میں رہتے ہیں۔ پینٹنگ اور سکلپچر کے ساتھ گھرے ہُوئے۔ گوستاو اُناسی سالوں کا نوجوان ہے، اور اس کی بیوی اٹھتر سال کی ہے۔ دونوں اپنے پھولوں کی گوڈی کرتے ہیں، اور اپنی اپنی موٹر چلا کر سارا دن گھومتے پھرتے ہیں۔ آرٹ گیلریوں میں، تھیٹروں میں، دوستوں کے پاس۔

بیبھی، گوستاو کی بیوی، کچھ بوڑھوں کا خیال بھی رکھتی ہے۔ ایک آرگنائزیشن ہے، جس کے ممبر پانچ سات بوڑھے اپنے ذمہ لے لیتے ہیں، اور یہ دونوں جوان بندے بوڑھوں کو ڈاکٹر کے پاس لے جاتے، اور اُن کے لئے سبزی بھاجی، مرغے، مچھلی خریدنے کا کام کر دیتے ہیں۔

آج کل وُہ اپنی موٹر میں ہی یورپ جانے کی تیاری کر رہے ہیں۔ یورپ ؟ گوستاو ہنستا ہے۔ بڑا ہندوستانی لفظ ہے، یورپ ! یہاں کے لوگ تو اس کو کانٹیننٹ کہتے ہیں۔ سال میں دو تین بار اگر وہ مہینے مہینے کے لئے اسی طرح خود ڈرائیو کر کے سفر نہ کر لیں، دُور دراز کے میوزیم اور آرٹ گیلریوں اور تھیٹروں کا، اُن کو بےچینی ہونے لگتی ہے، اور گوستاو موٹر اتنی تیز چلاتا ہے، کہ بس کچھ نہ پُوچھو۔ اَرپنا کہتی ہے، "کانٹیننٹ میں موٹر آہستہ چلانا، چھٹیاں ہیں، اور سڑکوں پر بھیڑ ہے۔" گوستاو ہنستا ہے، "جب بُوڑھا ہو جاؤں گا، اور بیس اکیس سال کے بعد، تب آہستہ چلایا کروں گا۔" ہندوستان میں بھی اتنا گھوما ہُوا ہے، کہ عام ہندوستانی بھی نہیں گھوما ہو گا۔

کسی کے گھر ایک لڑکا ملتا ہے، اکیس برس کا۔ ابھی تل ابیب سے آیا ہے۔ وہاں ہر ایک لڑکے اور لڑکی کو اٹھارہ سے اکیس برس کی عمر تک فوج میں رہنا پڑتا ہے۔ اگر اٹھارہ برس تک کسی لڑکی کی شادی ہو جائے، یا اگر وُہ یہودن بھکشنی بن جائے

تو اُس کو فوج میں جانے سے چھٹی مل جاتی ہے ۔۔۔ اسی لیئے کئی لڑکیاں شادی کے سرٹیفکیٹ خرید لیتی ہیں لڑکوں سے۔ اور پھر تین سال کے بعد طلاق۔

تم بھی فوج میں تھے؟

وہ نظریں چُراتا ہے۔ ہاں میں بھی فوج میں تھا، اور مجھے بڑی شرم آرہی ہے۔ ہم انکار نہیں کر سکتے۔ آرڈر ماننا پڑتا ہے۔ نہ مانیں، تو کورٹ مارشل، اور گولی۔ میں نے ابھی اپنی تین سالوں کی فوجی ڈیوٹی ختم کی ہے، اور میں چار دن سانس لینے کے لیئے لندن آگیا ہوں۔

بیروت پر جب حملہ ہُوا، تو تم بھی تھے؟

مَیں بھی تھا۔ ہماری بٹالین بھی بیروت میں تھی۔ یہ تصویریں ہیں۔

اور وہ مجھے رنگین تصویریں دکھاتا ہے۔ ٹینکوں کی۔ تباہی کی۔ میں اُس کو نہیں پہچان سکتی۔ سارے لڑکے اسی کی طرح کے معلوم ہوتے ہیں، جو ٹینس کھیلنے کی عمر میں گولیاں چلا رہے ہیں۔

وہ بتا رہا ہے۔ ۱۹۷۳ء اور ۱۹۷۴ء میں جو بم ہم نے خریدے تھے امریکنوں سے، اور امریکنوں نے کانٹریکٹ میں یہ لکھوایا تھا، کہ یہ بم صرف سیلف ڈیفنس میں استعمال کیئے جائیں گے، اور اُس وقت استعمال کیئے جائیں گے، جب باقی کے سارے ہتھیار ختم ہو چکے ہوں، اور کوئی راستہ باقی نہ بچا ہو۔ وُہی بم ہم بیروت پر پھینک رہے ہیں، نہتے لوگوں پر، معصوم بچوں پر، عورتوں پر، ہسپتالوں پر، سکولوں پر۔ اندھادھند! یہ بم فاسفورس سے بھرے ہوتے ہیں۔ اصل میں ایک بم صرف ایک اکیلا بم نہیں ہوتا۔ اتنے بڑے ڈھول (اور وہ اپنی بانہیں پھیلاتا ہے) جیسا بم ہوتا ہے، اور اُس کے پیٹ میں ڈیڑھ سو اور بم۔

جس وقت یہ بم اوپر سے گرایا جاتا ہے، تو درمیان میں آکر پھٹ جاتا ہے، اور

پھر اُس کے پیٹ میں سے نکلے ہُوئے چھوٹے بم دو میل کے ایریئے میں جا کر پھٹ جاتے ہیں۔ اس لیئے دو میل کے ایریئے میں نہ کوئی بلڈنگ بچتی ہے، نہ کوئی بندہ۔ آگ کے بھانبڑ مچ اُٹھتے ہیں۔

اور تین سال فوج میں رہ کر آیا ہُوا وہ لڑکا کانپ اُٹھتا ہے۔

میں تل اَبیب سے پرسوں آیا ہُوں۔ اُس دن وہاں بڑا بھاری مظاہرہ ہو رہا تھا، بیگن کے خلاف۔ زیادہ تر سٹوڈنٹس تھے، اور کالجوں کے پروفیسر، اور آرٹسٹ اور رائیٹر۔

نکلے گا، اَب ضرور نکلے گا۔ اصل میں سارا میڈیا سرکار کے کنٹرول میں چلتا ہے۔ بیرُوت کو جلائے پانچ دِن گزر چکے تھے۔ اور آج تک سرکار نے اسرائیل کے لوگوں کو اس کے بارے میں نہیں بتایا تھا۔ وُہ تو جب لوگوں نے بی۔ بی۔ سی کی اور باقی دنیا کی خبریں اپنے ریڈیو پر سُن لیں، تو سرکار نے بتایا، کہ ہاں ہم نے لبنان پر حملہ کیا ہے۔

مگر لبنان نے شہر خالی کیوں نہیں کروایا؟ سویلین کو نکال کر دُور اندر کیمپوں میں کیوں نہیں لے گیئے؟

وہاں عجیب سیچُوایشن ہے۔ لڑائی آمنے سامنے ہو رہی ہے، شہر کی گلیوں میں، بازاروں میں۔ مورچے لگے ہُوئے ہیں۔ لوگوں کو پی۔ ایل۔ او۔ گوریلے گھروں سے باہر نہیں نکلنے دیتے۔ کوئی بھی باہر نظر آئے، گولی مار دیتے ہیں۔ وہ لوگوں کو زبردستی وہاں شہر میں ہی رکھنا چاہتے ہیں۔ کیونکہ اسی طریقے سے ہی وُہ دُنیا کی ہمدردی جیت کر اسرائیل کے حملے کو ناکام بنا سکتے ہیں۔ بمبارمنٹ رکوا سکتے ہیں، اور سارے معاملے کا حَل ڈھونڈنے کی کوئی اُمید ہو سکتی ہے۔ اس لئے لوگ بے چارے کیا کریں؟ باہر جاتے ہیں، تو گولی کھا کر مرتے ہیں۔ گھروں کے اندر رہتے ہیں، تو بم سے فنا ہوتے ہیں۔

مگر پھر ہو گا کیا؟

پتہ نہیں۔

ہائیڈ پارک اور ریجنٹ پارک میں گھنے درختوں کی چھاؤں میں بوڑھے لوگ اکیلے بیٹھے ہیں۔ بچّے دوڑ رہے ہیں۔ جوان لڑکے لڑکیاں نشیلی چال میں چل رہے ہیں۔ جھیلوں میں بطخیں تیر رہی ہیں، اور چھوٹی کشتیاں۔

لندن شہر میں، باقی پرانے شہر میں، جو پرانی دہلی کے چاندنی چوک جیسا، یا لاہور کے بھاٹی دروازے جیسا گھنی آبادی والا پرانا گنجان شہر تھا، دوسری جنگ عظیم کے وقت بہت تباہی ہوئی تھی۔ پرانی دیواروں پر ابھی بھی بموں کے اور مشین گنوں کی گولیوں کے نشان ہیں۔ اُس ملبے کو صاف کر کے اسی حصّے میں اُنہوں نے ایک بہت ہی بڑا سینٹر بنایا ہے۔ اُوپر اور آس پاس رہنے کے لئے فلیٹ ہیں، بہت ہی عالیشان اور درمیانی بلڈنگ کے نچلے حصّے میں، جو ہماری پوری کناٹ پلیس جتنا بڑا ہے، باربیکل سینٹر بنایا ہے، کلچرل سینٹر۔ جس میں آرٹ گیلریاں ہیں، بڑے ہال ہیں، کنسرٹ ہال، تھیٹر ہیں، بار ہیں، لاؤنج ہیں، اور شیشوں سے ڈھانپے ہوئے باغات ہیں۔ بہت بڑا کیفے، کھلے صحن، فوارے، بُت، پینٹنگز۔

پورا شہر بسا ہوا ہے۔ نرم، گدگدے قالینوں سے ڈھکا ہوا۔ لندن سٹی کی سرکار نے، یعنی میونسپلٹی جیسی سرکار نے اس سینٹر کا پورا خرچ فلیٹوں ہی سے نکال لیا ہے۔

سو اگر تہیہ ہو، اور ساتھ کسی کی آنکھ میں سپنا ہو، اور سپنے والی آنکھ کے ہاتھوں میں طاقت بھی ہو، تو کیا نہیں ہو سکتا؟

سوچتی ہوں، کہ ہندوستان کا یہی المیہ ہے، جن کے پاس سپنا ہے، اُن کے

پاس طاقت نہیں، اور جن کے پاس طاقت ہے، اُن کے پاس سپنا نہیں۔

بَس میں ایک انگریز عورت بیٹھی ہے۔ پاس سے گزرتے ہوئے میری ساڑھی کا پلّو اُس کے گھٹنے سے چھُو گیا۔ وہ نہایت غصّے سے بولی، "ڈونٹ ٹچ می۔" مجھے بھی غصّہ آگیا۔ میں نے سوچا، لو، یہ ایک اور ملی، ہندوستانیوں کو، اور سارے کالی بھوری چمڑی والوں کو نفرت کرنے والی۔ ذرا بتاؤں اس کو آٹے دال کا بھاؤ۔ لیکن میرے مڑ کر حملہ کرنے سے پہلے ہی، وہ اپنے ساتھ بیٹھی انگریز عورت سے لڑنے لگ گئی ــــ

"تم میری سکرٹ پر کیوں بیٹھی ہو؟ دُور ہو کر بیٹھو۔ آئی ہیٹ یُو، ٹچنگ می۔ آئی ہیٹ اینی باڈی ٹچنگ مِی!"

اور پھر وہ مُنہ میں بڑبڑانے لگی۔ اُس کا ہاتھ جلدی جلدی، بالوں کو پچھلی طرف کو سنوارنے لگا۔

او خدایا، اس کو تو اپنی ہوش ہی نہیں۔
شائد کسی کے لمس کو ترستے ترستے، یہ ہر لمس کو نفرت کرنے لگی ہے۔

بل، ایک نوجوان ڈاکٹر کہتا ہے، اس مُلک میں سو میں سے پچاس بیمار اسی طرح کے ہی ہیں۔ جن کو جسم کی کوئی بیماری نہیں، جن کے صرف مَن بیمار ہیں۔ کیونکہ اس مُلک میں تنہائی بہت ہے۔ بھیانک گھنگھور تنہائی۔ اور بھاگ دوڑ بہت ہے۔ سٹرین بہت ہے۔

ایک چھوٹے سے تھیٹر میں ڈرامہ دیکھا، "آن دی ونگز آف دی مارننگ"، بِلّھی وِیسٹ کی ایکٹنگ کمال کی ہے۔

ایک ڈرامہ پڑھا ہے۔ جرمن رائیٹر فریڈرک ڈورینمیٹ کا، "دی وزٹ"،

کمال! امرتاجی، آپ بھی ضرور پڑھیں۔ اگر وہاں نہ ملے، تو مجھے لکھیں، میں لے آؤں گی۔ اور ایک وُڈی ایلن کی کتاب پڑھی ہے، "سائیڈ افیکٹس"۔ ایبسٹریکٹ کہانیاں۔ آپ نے وُڈی ایلن کی فلم دیکھی تھی، "مین ہیٹن"؟ مجھے یاد نہیں، کہ میں نے لندن میں دیکھی تھی، یا لندن میں۔ کمال تھی فلم بھی۔

"ٹائم آؤٹ" بے حد مشہور میگزین ہے۔ سارے لندن کے سارے تھیٹر، مووِیز، میوزک کانسرٹس، راک میوزک، نیلی فلمیں، کھیلیں، شاعری کی محفلیں، سیاحت، لیکچر، ریسٹورنٹ، ریڈیو اور ٹیلیویژن کے پروگرام، آرٹ گیلریاں اور میلے سب کچھ۔ پورے ہفتے کا پروگرام۔ تقریباً ہر گھر میں یہ خریدا جاتا ہے۔ ہر ٹورسٹ ضرور خریدتا ہے۔ اُس میں آخری آٹھ دس پندرہ صفحے اس طرح کے پرسنل اشتہارات سے بھرے ہوتے ہیں۔ میرے پاس دو کمروں کا فلیٹ ہے۔ فلاں مارکہ کی کار ہے۔ میری ہابی ہے، اپنی کشتی لے کر ویک اینڈز کو سمندر میں چلے جانا، اور لمبی ڈرائیو کرنا۔

ضرورت ہے، ایک ساتھی کی، دو ماہ کے لیئے۔ "میں لیزبین ہوں۔ میری عمر تیس سال ہے، قد ساڑھے پانچ فٹ، وزن اتنا، ایک کمرے کا فلیٹ ہے۔ ساتھی کی ضرورت ہے۔ لڑکی کا قد پانچ فٹ دو انچ، یا زیادہ سے زیادہ تین انچ ہو۔ اور عمر تقریباً بیس سال ہو۔ مَیں گے ہوں (یعنی ہوموسیکسوئیل) مجھے ایک پتلا، گریس فُل، اور ساڑھے پانچ فٹ لمبا لڑکا چاہیئے۔ فلیٹ شیئر کرنے کے لیئے۔ پہلے ایک ماہ کا کنٹریکٹ ہوگا۔ جو بعد میں سال کے لیئے بڑھا دیا جائے گا، اگر ہم آپس میں ایک دوسرے کو پسند ہوئے، تب"۔

پکاڈلی کی گلیوں میں ہمیشہ کی طرح ننگی سیکس فلمیں دکھائی جا رہی ہیں۔ ننگے شو

ہو رہے ہیں۔ نو مَن کی دھوبن جیسے بکسے میں دس پینی کا سکہ ڈال کر دو تین منٹ کی انٹرکورس کی فلم دیکھی جا سکتی ہے، اُسی طرح ایک چھوٹے سوراخ سے آنکھ جوڑ کر۔ سیکس کا سامان اُسی طرح دوکانوں پر فروخت ہو رہا ہے۔

لیکن یہاں صرف ربڑ کے انگ فروخت ہوتے ہیں۔ ہندوستان میں تو، بندے ہی اتنے سستے فروخت ہوتے مل جاتے ہیں۔ تیس روپے مہینہ دے کر، یعنی کوئی دو پونڈ سے بھی کم۔ پورا مہینہ غسل خانے صاف کروالو، کوڑا صاف کروالو۔ یہاں ایک گھنٹے کی مزدوری دو پونڈ ہے۔ اور مجال ہے، کہ آپ گھٹیا کام کرنے والے کو گھٹیا سمجھیں۔ اپنی دیوتا کی نگری میں تو اس کو بندہ ہی نہیں سمجھا جاتا۔

ایک پب میں تھوڑے سے اونچے اسٹیج پر کھڑے ہو کر ایک نیگرو عورت گا رہی ہے۔ موٹی، لٹکیاں چھاتیوں والی، بیلون کی طرح پھولے گال، اور چھتے کی طرح پھولے بال، موٹے بینگنی ہونٹوں کو گول کر کے اونچی آواز میں گا رہی ہے۔ لفظ تو کوئی کوئی ہی سمجھ آتا ہے، مگر میں لفظوں کو سمجھنے کی کوشش چھوڑ کر اپنے آپ کو اُس کی آواز کے سیلاب میں بہہ جانے دیتی ہوں۔ آواز ہے، کہ کالے پہاڑوں کی خوفناک چٹانوں کو پھاڑ کر بہتا چشمہ، جس میں دریاؤں سے زیادہ زور ہے، اور روانی۔ یوں لگتا ہے، اس کے پیٹ کے کنوئیں میں سے وہ آواز نکل رہی ہے۔ آواز کی تھرتھراہٹ کے ساتھ اس کی چھاتیاں بھی ڈول رہی ہیں۔ مائیک ہاتھ میں پکڑ کر وہ پاؤں کے ساتھ تال دے رہی ہے، اور اپنی موٹی کمر پر ذرا ذرا ڈول رہی ہے۔

میں سوچتی ہوں، یا خدایا، اگر یہ کالے لوگ اس طرح گا سکتے ہیں، ساری دُنیا کے ظلم برداشت کر کے بھی، اس طرح بے ساختہ کوئل کی طرح، آبشاروں کی طرح، جھرنوں

کی طرح گا سکتے ہیں، تو ان میں کوئی نقص نہیں ہو سکتا۔ نقص ضرور ان ہی لوگوں میں ہو گا، جو ان پر ظلم کرتے ہیں۔

پریس کلب میں ایک جرنلسٹ کافی پیتے ہوئے کہتا ہے، "ہماری مارگریٹ اور تمہاری اندرا بھی بس کمال ہیں۔ اصل میں عورتیں ہوتی ہی کمال ہیں۔ خاص کر جب ان کے پاس پاور ہو۔ برٹن کی اکانومی جہنم میں جا رہی ہے، لوگ بے حد دکھی ہیں، اور اس عورت نے جا فاک لینڈ پر حملہ کر دیا۔ لوگ قومی ترانے گانے میں مصروف ہو گئے، توجہ دوسری طرف ہو گئی۔ مارگریٹ تھیچر کی کرسی بچ گئی۔ فاک لینڈ کی دھوپ سینکتی سینکتی ہی شاید دوسری ٹرم بھی لے جائیں گی۔ اسی طرح آپ کی اندرا۔ جب بھی لوگ تلملانے لگے، جا بنگال دیش میں لڑائی چھیڑ دی۔ بالکل ہماری طرح ہی۔ بنگالیوں کو پاکستانی ملٹری کے ایگریشن سے نجات دلانے کے لئے۔ یا یہ شور مچا رکھا کہ پاکستان ہتھیار خرید رہا ہے، ملک کو خطرہ ہے۔ بس، کرسی قائم۔"

آف کورس، میں اس کے ساتھ لڑتی ہوں، بحث کرتی ہوں۔ اپنے ملک کو بچاتی ہوں، اور اپنی اندرا گاندھی کو۔ لیکن میری آواز پریس کلب کے شور میں بڑی کمزور سی لگتی ہے۔ میاؤں جیسی۔

سنڈے ٹائمز کے پہلے صفحہ پر خبر ہے، کہ پورٹ لینڈ کی برنس سمتھ نے پرائم منسٹر مارگریٹ تھیچر پر مقدمہ کیا ہے، کہ اس کا بیٹا رچرڈ گذشتہ تین سال سے بیکار ہے۔ اس بیکاری کی وجہ سے اس کے من پر جو قہر ٹوٹا ہے، اس کے لئے تھیچر ذمہ دار ہے۔ اور اس کو ایک لاکھ پونڈ ہرجانہ دینا چاہیئے۔ ہائیکورٹ نے تھیچر کو نوٹس جاری کر دیا ہے۔

خبر کے ساتھ رچرڈ کی ماں برنس سمتھ کی تصویر بھی چھپی ہے۔

ویسے یہ اور بات ہے، کہ یہاں ہر بیکار بندے کو ہفتہ کے کم از کم بتیس پونڈ سرکار کی طرف سے 'بیکاری بھتے'، کے طور پر دیئے جاتے ہیں۔ اگر گھر کا کرایہ بھی سرکار نے دینا ہو، تو تقریباً پچپن پونڈ۔ اور اگر اس بندے کی بیوی ہے، اور بیوی بھی بیکار ہے، تو بیوی کو علیحدہ بیکاری بھتہ ملے گا۔ اور اگر بچے بھی ہوں، تو بچے پالنے کے لئے علیحدہ پیسے۔ اگر مکان گروی رکھا ہُوا ہے، یا بیمے کی قسط دینی ہے، یا کسی قرضے کا سُود دینا ہے، وُہ بھی سرکار ہی دے گی، بیکاری کے دوران۔

ہندوستانیوں میں دو قسم کے بندے ہیں۔ ایک تو وُہ جن کو پیسے کمانے کے علاوہ زندگی کے ساتھ کوئی دلچسپی ہی نہیں۔ اور وہ دن رات پونڈ جمع کرنے کے کام میں لگے ہُوئے ہیں۔ ہفتہ کے ساتوں دِن کام کرتے ہیں، اوور ٹائم لگاتے ہیں، اور گھر آ کر سو کر پھر کام پر جا پہنچتے ہیں۔ ایک بس کا ڈرائیور بھی یہاں دن رات محنت سے کام کر کے ڈھائی سو پونڈ ہفتہ کے کما لیتا ہے۔ یعنی کوئی تیرہ چودہ ہزار روپے ماہانہ۔

اور دوسری طرف وہ لوگ ہیں، جو کام کرنے میں یقین ہی نہیں رکھتے۔ ٹھاٹھ سے ہر ہفتہ جا کر اپنے بھی اور اپنی بیوی کے پیسے بھی سرکار سے لے کر جیب میں ڈالتے ہیں۔ ٹھاٹھ سے بچے پیدا کرتے ہیں، کیونکہ بچوں کے حصّے کے اور پیسے ملیں گے۔ اور اس کے ساتھ اس مُلک میں اپنی بھُوری نسل کو بھی تو بڑھانا ہے۔ کل کو اپنے ہی کام آئیں گے، گوروں کی ایسی تیسی کرنے کے لیئے۔ انہوں نے ہمارے مُلک میں عیش نہیں کیا، ہمارے ہی سر پر؟ اب ان کو نیچا نہیں دکھانا؟ تاریخ کے پہیئے کا چکر پُورا نہیں کرنا؟

ہر بچہ جو اس مُلک میں پیدا ہوتا ہے، وُہ برٹش سٹیزن ہے۔ کئی ہندوستانی پاکستانی ماں باپ کے بچے برٹش ہیں۔

خبر ہے، کہ پرندوں کی حفاظت، کرنے والی سوسائیٹی "دی رائل سوسائیٹی فار دی پروٹیکشن آف برڈز" ہر سال ہزاروں پرندوں کو آپ مار دیتی ہے۔

ان میں سے بہت سے پرندے سمندری پرندے ہیں وسی گالز۔ (چیخوف کا ڈرامہ "سی گالز" یاد ہے۔) چھوٹے چھوٹے سینڈوچز میں زہریلی دوائی لگا کر سائینسدان ان پرندوں کے گھونسلوں کے قریب رکھ دیتے ہیں، اور آپ چلے جاتے ہیں۔ یہ سینڈوچز کُترتے ہی دس منٹ کے اندر اندر یہ خوبصورت سفید پرندے بے ہوش ہو جاتے ہیں۔ دو گھنٹے کے بعد جب سائنسدان واپس آتے ہیں زیادہ پرندے مر چکے ہوتے ہیں۔ اُن کی لاشیں اور بقایا سینڈوچز بوریوں میں بھر لیئے جاتے ہیں۔ اور جو پرندے ابھی صرف بے ہوش ہی ہوں، اُن کے سروں پر ہتھوڑا مار کر اُن کو مار دیا جاتا ہے۔

یہ گزشتہ دس سال سے ہو رہا ہے۔ لیکن کوئی اس کے بارے بات نہیں کرتا۔ کیونکہ اس طرح ملک کا امیج، خطرے میں پڑ جائے گا۔

مگر یہ قتلِ عام کیوں؟

کیونکہ اس صدی میں وسی گالز، کی آبادی تیس گنا بڑھ گئی ہے۔ ویسے تو یہ بے چارے پرندے انسان کا کچھ نہیں بگاڑتے، صرف سمندر میں سے چھوٹی مچھلیاں کھاتے ہیں۔ کوڑا اور گندگی جو شہر کی نالیاں سمندر میں اُگلتی ہیں، وہ کھاتے ہیں۔ لیکن یہ آس پاس کے چھوٹے جزیروں میں پھیلتے جا رہے ہیں، جہاں پہلے "ٹرنز" گھونسلے بنایا کرتی تھیں۔ "ٹرنز" سفید روئی کے گالوں جیسے پَر، اور کالا سیاہ سَر۔ یہ "ٹرنز" سردی کے موسم میں افریکہ چلی جاتی ہیں۔ اُن کے واپس آنے سے تقریباً چھ ہفتے پہلے وسی گالز، جزیروں پر اپنے گھونسلے بنا کر انڈے دے دیتے ہیں۔ اور جب "ٹرنز" واپس آتی ہیں وسی گالز، اُن سے لڑ جھگڑ کر اُن کو جزیروں سے باہر نکالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ "ٹرنز" کو بچانے کے لیئے وسی گالز، کو قتل کیا جاتا ہے۔

اور پھر یہ کہتے ہیں، کہ کیمونزم غلط ہے، انقلاب کفر ہے۔

میں کچھ لوگوں سے پوچھتی ہوں، "جب پہلی دفعہ آپ لندن آئے تھے، تو سب سے عجیب کون سی بات لگی تھی؟ ایسی بات جس نے حیران کر دیا ہو؟" بہت لوگ کہتے ہیں، "اتنا بڑا شہر، لوگ! بھیڑ!" گاڑیاں! زمین دوز ریلیں، زمین کے نیچے اور بہت نیچے، گہرائی میں ڈگڑ ڈگڑ کرتی گاڑیاں۔ خود کھلتے اور خود بند ہوتے دروازے!" خود بخود چلنے والی سیڑھیاں۔ پہلی بار اس نے خود کار سیڑھی پر پاؤں رکھتے ہوئے میرا کلیجہ کانپ اٹھا تھا۔ خوشبو، ہر بندہ، ہر عورت، جس وقت پاس سے گزرتی ہے، تو خوشبوئیں اڑاتی ہوئی۔"

چیزوں سے بھری دوکانیں! جس سڑک سے بھی گزر جاؤ، ٹھونسے ہوئے سٹور! اتنی چیزیں! ڈبوں جیسے مکان! کھلونوں جیسے، جیسے ماچیس جوڑ جوڑ کر رکھی ہوں، پاس پاس، ایک جیسے۔"

جب میں پہلی دفعہ یہاں آئی تھی، تو شام کے وقت حیران ہو کر کبھی گھڑی کی طرف دیکھتی تھی، تو کبھی سفید دودھیا آسمان کی طرف۔ جس میں رات کے آٹھ نو بجے تک سورج کسی ضدی بچے کی طرح اڑ کر کھڑا رہتا تھا، اور رات کے گیارہ بجے تک اندھیرا نہیں ہوتا تھا۔

انگریز اپنے آپ میں اتنے گم ہیں، کہ حیرانی ہوتی ہے۔ ہر بندہ اپنی چھتری اور اخبار اٹھائے چلا جاتا ہے۔ گاڑیوں میں بیٹھے نہ ایک دوسرے سے بولتے ہیں، اور نہ ہی ایک دوسرے کی طرف دیکھتے ہیں۔ گاڑی کے کسی بھی ڈبے میں اگر پچاس بندے بیٹھے ہوں، تو کم از کم تیس پینتیس بندے اخبار پڑھ رہے ہوں گے، دو تین کتاب پڑھ رہے ہوں گے، باقی کے چپ چاپ آمنے سامنے تاکتے جا رہے ہوں گے۔

گھر پلٹتے ہوئے وہ ایوننگ سٹینڈرڈ میں سے کراس ورڈ بھر رہے ہوتے ہیں۔ اپنی اپنی اخبار کے اپنے چوکھٹے میں مگن۔

اگر کسی انگریز مرد کو میں نے کبھی لاڈ سے بات کرتے دیکھا ہے، تو اپنے کتے سے۔ کتوں سے یہ عجیب طریقے سے جذباتی ہیں۔ تقریباً ہر گھر میں کم از کم ایک کتا ضرور ملے گا۔ سہ پہر کے وقت کتوں کو ٹہلانے کے لئے نکلتے ہیں۔ جب ہر سڑک پر فضلے اور پیشاب کے ڈھیر لگ جاتے ہیں۔ اندازہ ہے، کہ ہر روز انگلینڈ کی سڑکوں پر کتوں کے فضلے کا وزن تقریباً پچاس ٹن ہوتا ہے۔

ہاں، انگریز عورتوں کو آپ کبھی کبھی بطخوں کی طرح قیں قیں کرتے سن لیتے ہیں۔ دنیا بھر کی عورتوں کی طرح انگریز عورتوں کو بھی پڑوسنوں کی برائیاں، چغلیاں کرنے کا اور کپڑوں کی باتیں کرنے کا بڑا شوق ہے۔ یہ اور بات ہے، کہ زیادہ عورتیں باہر کام کرتی ہیں، اس وجہ سے ان کو اس مشغلے کا وقت کم ملتا ہے۔ لیکن اگر دو سہیلیاں گاڑی میں یا بس میں مل جائیں، تو ایک ہی سانس میں بولتی چلی جائیں گی۔

ویسے انگریز قوم کافی خوش رہنے والی قوم ہے۔

باتیں صرف جوان لڑکے لڑکیاں کرتے ہیں۔ باتیں اور پیار۔ ہنستے بھی وہی نظر آتے ہیں۔ باقی قوم کافی گمبھیر ہے۔

جو لوگ پنجاب سے یہاں آئے ہیں، ان میں سے ننانوے فی صدی لوگ دیہاتوں سے آئے ہیں۔ کچھ لوگوں کو آئے ہوئے پچیس تیس سال ہو گئے ہیں۔ پچیس تیس سال پہلے کے دیہاتوں کے رسم و رواج، قدریں قیمتیں، غلط سوچیں، وہ اپنے ساتھ لے آئے ہیں، اور آج تک ان کو سنبھال کر اٹھائے پھرتے ہیں۔ بہت سے گھروں میں ابھی تک مرد اور عورتیں گھروں میں علیحدہ کمروں میں رہتے ہیں۔ مردوں کی شام

پَب (شراب خانہ) میں گزرتی ہے، جہاں وہ اپنی بیویوں کو ساتھ لے کر نہیں جاتے۔ محفلیں صرف مردوں کی ہوتی ہیں۔ عورتیں باورچی خانے سے ملحقہ کمرے میں بیٹھ کر زیورات، کپڑوں کی اور گاؤں جانے کی باتیں کرتی ہیں۔

اور ہر بندہ یہی سوچتا ہے، کہ وُہ پیسے کما کر واپس چلا جائے گا، اور آرام سے سردیوں کی گرم دُھوپ سینکے گا، ساون کی بارش میں بھیگے گا، اور گرمیوں کی لمبی دوپہر میں تُوت کی چھاؤں میں چارپائی ڈال کر اُونگھے گا۔

مگر وُہ وقت کبھی نہیں آتا۔

وقت کا پہیّہ گھُومتا جاتا ہے، تیزی کے ساتھ۔ یہاں پر پیدا ہُوئے بچّے بڑے ہوتے جاتے ہیں، اُن کی جڑیں یہاں ہیں۔ ماں باپ بُوڑھے ہو رہے ہیں، جنہوں نے ایک ایک کمرے میں دس اور مزدوروں کے ساتھ باری سے سو کر یہاں مکان خریدے ہیں، کاریں خریدی ہیں، اور ہر پل واپس جانے کے لئے ترستے ہیں، اُن کی نرم پڑ چکی جڑوں کی طرف وُہ عجیب لاپرواہی سے دیکھتے ہیں۔ اور جب واپس پنجاب کے گاؤں کی طرف جب وہ دیکھتے ہیں، تو وہاں اُن کو صرف گندی نالیاں، بھُوک غریبی اور مکھیاں بھِنبھِناتی نظر آتے ہیں۔

اور..... بہت دیر کہیں بیٹھ کر اُٹھنے کی کوشش بھی کریں، تو اُٹھا نہیں جاتا۔ کیونکہ جسموں میں سے بھی جڑیں اُگ آتی ہیں، جو نیچے دھرتی میں اُتر جاتی ہیں۔ انسان خود بَرگد کا درخت بن کر رہ جاتا ہے۔

ٹیلیویژن پر ایٹم بم کے پہلے تجربے کی فلم دکھائی جا رہی ہے۔ جگہ امریکہ، مہینہ کا۔ سن اُنیس سو پینتالیس۔ دُور دراز، اُجاڑ بیابان میں پہلا بم چلا کر اُنہوں نے دیکھا تھا۔ آس پاس سینکڑوں میلوں میں لوگوں کو باہر نکال دیا گیا۔ اگر کوئی پُوچھے، تو اسے کچھ نہیں بتایا جاتا تھا۔ پھر بھی، جب ایٹم بم پھٹا، تو لوگوں کو لگا، کہ سُورج پھٹ گیا ہے۔

اتنی تیز چکا چوند اور گڑگڑاہٹ والا دھماکہ۔ سینکڑوں میل دور رہتے لوگوں نے یہ سورج پھٹتے دیکھا تھا۔ سینکڑوں میل دور رہتے لوگوں کے گھر تھر تھر کانپے تھے۔ چھتیں گر گئی تھیں۔ دیواروں کے دل پھٹ گئے تھے۔ شاید تجربہ کرنے والوں کو خود بھی اس بات کا گمان نہیں تھا، کہ اتنی دور تک اس کا اثر ہوگا۔ میلوں کے میل زمین کانپ کر بنجر ہوگئی تھی۔ چٹانیں پگھل گئی تھیں۔ زمین کا جلا ہوا جسم پگھل گیا تھا۔

پہلی بار ایٹم بم چلانے کے بعد، جب معلوم ہوا، کہ یہ بم اتنی تباہی پھیلا سکتا ہے۔ تو گنجان شہر ہیروشیما پر، سوئے ہوئے لوگوں کے سروں پر دوسرا بم پھینکا گیا۔ گنجان بستا شہر ملبے کا ڈھیر بن گیا۔ تاریخ چھ اگست۔ سن انیس سو سنتالیس۔ اور تیسرا بم تین دن کے بعد ناگاساکی کے اوپر۔ ان دھماکوں کو سن کر اگر دھرتی میں دم ہوتا، تو پھٹ جاتی، اگر آسمان میں ذرا بھی حیا ہوتی، تو جھک جاتا۔

اور اس کے بعد، آج تک، گزشتہ سینتیس سال سے ہر ملک اسی دوڑ میں ہے، کہ اس کے پاس ایٹم بموں کا ڈھیر دوسروں سے زیادہ بڑا ہو جائے۔ اربوں کھربوں ڈالر اس دوڑ میں، یعنی موت کے ڈھیر کو بڑا کرنے کے لئے ہر پل خرچ ہو رہے ہیں، سینتیس برس سے۔ موت کے ڈھیروں کی چھاؤں میں مائیں بچوں کو جنم دے رہی ہیں، اور دنیا کی نصف آبادی رات کو بھوکی سو رہی ہے۔

حساب لگانے والے لوگ کہتے ہیں، کہ اگر ایک سال بھی ایٹم بموں والا اور دوسرے ہتھیاروں والا پیسہ سارے ملک روٹی کمانے پر لگا دیں، تو کوئی بھی بھوکا نہ رہے۔

ایڈنبرا میں ہر سال کی طرح تھیٹر کا، اور سنگیت کا اور ناچ کا میلہ ہو رہا ہے۔ امریکہ سے آیا ہوا ایک تھیٹر کا کلاکار ولی برومر، کہتا ہے، کہ امریکہ جتنے پیسے

ہر سال ملٹری بینڈ پر خرچ کرتا ہے، اُس سے نصف پیسے کلا پر خرچ کرتا ہے۔ کلا کار امریکہ ہی میں چوہوں جیسے غریب ہوتے ہیں۔ اگر کوئی پوچھے، کیا کام کرتے ہو؟ تو بندہ کہے، میں کلا کار ہوں، تو اگلا سوال یہ ہوتا ہے، یہ تو ٹھیک ہے، مگر روٹی کمانے کے لئے کیا کرتے ہو؟ کیونکہ پتہ ہے، کہ کلاری سے پیٹ نہیں بھرتا۔ سب کو پتہ ہے۔

پینتالیس سالہ یہ کلا کار اور تھیٹر ڈائریکٹر اس دفعہ ایڈنبرا میں چار ڈرامے کھیل رہا ہے۔

تنویر حبیب اپنے چھتیس گڑھ کے نوٹنکی بازوں کو لے کر یہاں 'چرن داس چور' ڈرامہ کھیلنے آیا ہوا ہے۔ تیس عورتیں مرد اور ایک بچہ۔ 'ریورسائیڈ سٹوڈیوز' میں چھتیس گڑھیوں نے زور نقش لگا رکھی ہیں۔ اگلے ہفتے کارڈف جا رہا ہے۔ چیپٹر آرٹ سینٹر میں 'چرن داس چور' کھیلا جائے گا۔


SAMOSA
"SAREE" CEN
SOUTHALL
دہلی سے تو جہاز میں سوار ہوئے تھے، انگلینڈ
کے لیے۔ مگر یوں لگتا ہے کہ..... سالوں
نے پھر پھگواڑے ہی اُتار دیا ہے۔

'فیسٹیول آف انڈیا' چل رہا ہے۔ کروڑوں روپے خرچ کیئے جا رہے ہیں۔ تاکہ یہاں ہندوستان کا 'امیج' بنے۔ لیکن اخباروں میں ڈھی پرانے قسم کے آرٹیکل ہیں۔ ہندوستان کا مذاق اُڑاتے، اُس کی غربت اور فرسودہ سماجی قیمتوں کی شان پر فقرے چھیلتے، لٹکاتے۔ ابھی مائیکل ہلر ائیڈ کا ایک آرٹیکل پڑھ رہی تھی، آبزرور میں۔ نام ہے 'بھارت ماتا کے پُتر اور عاشق'۔ بھارت ماتا کے ساتھ اندرا گاندھی کی ترجیح، سات بَل مار کر، اور اندرا گاندھی کے ساتھ گاؤ کی تشبیہ، اس کو بھی ہندوستانی ماتا کہتے ہیں، اور گاؤ کو بھی۔ حیران ہوتی ہوں، کہ اس طرح کے آرٹیکلز کے بعد ہم خاموش کیوں رہتے ہیں؟ اور کون سا 'امیج' بنا رہے ہیں، اور لطف کی بات یہ کہ اس مائیکل ہلر ائیڈ کو ہندوستان میں لیکچر دینے کے لئے بُلایا گیا تھا، اور لیکچر ٹُور سے واپس آکر اس نے یہ آرٹیکل لکھا ہے۔ اور ساتھ بڑی تصویر ایک بھیڑ کی، اور دیہاتی عورتوں کی۔ کُل مِلا کر ایک تہائی صفحہ۔

میلے کو شروع ہوئے سات ماہ گزر چکے ہیں۔ آج تک میلے میں ہوئی شاہی نمائشوں کے بارے، سارے ناچوں کے بارے، ساری آرٹ ایگزیبیوشنوں کے بارے، سارے ڈراموں کے بارے، جو بھی چھپا ہے، اچھا بُرا، وہ کل ملا کر اخبار کا ایک تہائی صفحہ نہیں بنتا۔

لیکن کبھی کبھی اخباروں میں کھری کھری باتیں کوئی کوئی جرنلسٹ کر دیتا ہے۔ "ایلین پالٹر" کا چھوٹا سا آرٹیکل ہے، "گارڈیانا" کے ایک کونے میں دبکا ہوا، "فاک لینڈ پر حملہ کرتے وقت برٹن نے جن سنہری اصولوں کا شور مچایا تھا "ڈیموکریسی کی حفاظت"، "بے چاری برٹش جنتا کی رکھوالی" وہ سارے کہاں اصول چلے گئے تھے؟ جب ۱۹۶۵ء میں "ڈیگو گارشیا" کو اور اس کے شہریوں کو بیچ کھایا تھا؟ ہم نے پورے کا پورا جزیرہ اور اس کی آبادی کو امریکہ کے ہاتھ فروخت کر دیا تھا، کیونکہ امریکہ "انڈین اوشن" کے اس جزیرے پر فوجی اڈے بنانا چاہتا تھا۔ تقریباً دو ہزار شہریوں کو ہم نے مفت ٹکٹس دے کر سیر کرنے کے لیئے بارہ سو میل دور ماریشیس بھیج دیا، اور وہاں پہنچا کر ان کے پاسپورٹ چھین لیئے۔ ان میں سے زیادہ لوگ آج بھی ماریشیس کے "سلمز" میں سڑ رہے ہیں۔ ۱۹۷۲ء میں ایک رائے شماری ہوئی تھی، کہ ان اجڑے ہوئے لوگوں میں سے چھبیس گھنے بھوک سے ختم ہو گئے، اور انیس لوگوں نے خودکشی کر لی۔

روس سائبیریا میں سے نکلتی گیس کو مغربی یورپ میں پہنچانے کے لیئے تین ہزار میل لمبی پائپ لائن بنا رہا ہے۔ اس پائپ لائن کے لیئے اس نے انگلینڈ کو، فرانس کو، مغربی جرمنی کو، اور اٹلی کو کروڑوں پونڈز کی کمپائینیں اور کمپریشر بنا کر دینے کا آرڈر دیا ہے۔ کچھ مال تیار ہو کر جہازوں میں لادا جا چکا ہے۔ امریکہ کو یہ دیکھ کر بہت تکلیف ہو رہی ہے۔ پریذیڈنٹ ریگن کو خوف ہے، کہ اس طرح تو یہ کمبخت روسی بہت طاقتور ہو جائیں گے، اور ساتھ ہی مغربی یورپ سے ان کی دوستی بڑھ جائے گی جن ملکوں میں روس کا پیسہ آئے گا، اور پھر روس کی گیس آئے گی، وہ ملک کل کس طرح امریکہ امریکہ کے کہنے پر روس سے جھگڑا کریں گے؟

اسی لئے ریگن نے بھبکی ماری، "مال کی سپلائی روک دو، ورنہ میں امریکہ سے ان کمپنیوں کو مال آنا بند کر دوں گا۔" اور ان ملکوں کی سرکاروں کو علیحدہ دھمکیاں۔ اصل

میں امریکہ کو خوف ہے، کہ اس پائپ لائن سے رُوس کی مالی حالت بہت مضبوط ہو جائے گی۔

اگر انگلینڈ، فرانس اور مغربی جرمنی کی حکومتیں ریگن کی دھمکی مان لیں، تو زندہ کیسے رہیں؟ ماننے سے مالی نقصان بھی ہوگا، اور ناک بھی کٹ جائے گی۔ لوگ کہیں گے، کہ اگر امریکہ نے ہی ہم پر حکومت کرنی ہے، تو آپ پھر کس مرض کی دوا ہیں؟

اور وہ اس لئے دھمکیوں کو نہیں مان رہے۔

جہازوں میں مال لادا جا چکا ہے، جہاز روس کی طرف روانہ ہو رہے ہیں۔

اور اب جب ریگن نے دیکھا ہے، کہ یہ دھمکیاں تو اُلٹی پڑ گئی ہیں، تو سمجھوتے کا راستہ ڈھونڈا جا رہا ہے۔ اگر پولینڈ میں مارشل لاء ہٹا دیا جائے، اور رُوس اپنے اُدھار دیئے ہوئے پیسوں کے لئے پورا سُود مغربی یورپ کے مُلکوں کو دینے کے لئے مان جائے، تو مال کو جانے دیں، پائپ لائنیں بننے دیں، وگرنہ نہیں۔

رسّہ کشی جاری ہے۔

لیکن یہ وُہ رسّے نہیں ہوتے، جن کا لوگ پھندہ بنا کر خودکشی کر لیتے ہیں۔

ہر سال لندن کے "نائیٹینگل گیٹ" کے علاقے میں کالے لوگ، اپنا میلہ لگاتے ہیں۔ ساری رات ناچتے، گاتے، شراب پیتے، کُڑیاں ڈالتے زندگی کا جشن مناتے ہیں۔ ساری رات سڑکوں پر بیساکھی کے میلے جیسا ہنگامہ ہوتا ہے، اور مستی جھُومتی ہے۔ اپنا رنگ، نسل، ہوتے قتل اور ظلم، زندگی اور روزگار کے غم، سب کچھ بُھلا کر ساری رات لوگ ناچتے رہتے ہیں، ڈھلیاں بجاتے رہتے ہیں۔ اور بیچ بیچ کئی کالے لڑکے گوری لڑکیوں کے ساتھ ناچتے رہتے ہیں، اور گورے لڑکے کالی لڑکیوں کے ساتھ۔ زندگی کی ساری تلخی بھُول کر ایک رات کے لیے یہ باقی کے انگلینڈ کے باسیوں کے برابر ہو جاتے ہیں۔

ویسے برابری کے لئے جدوجہد ہمیشہ کی طرح جاری ہے۔ سرکار برابری کی بات کرتی ہے، لیکن ورکشیل ڈسکریمیشن، یعنی رنگ بھید کو ہٹانے کے لئے ہمیشہ سخت قدم اُٹھانے سے کتراتی ہے۔ آج تک صرف ایک کمشن بنایا ہے "کمشن فار رٹیشیل ایکوئلیٹی"۔ گزشتہ پانچ برسوں میں اُس نے بھی سرسری طور پر بارہ کیسوں کی جانچ پڑتال کی ہے، جہاں رنگ بھید کی وجہ سے لوگوں کو کام نہیں دیا گیا تھا، یا ویسے مار کٹائی ہوئی تھی۔ پانچ برسوں میں صرف بارہ کیسوں کی جانچ پڑتال! یہ مذاق نہیں ہے؟

آج تک جتنے بھی رنگ بھید کے مقدمے عدالتوں میں پہنچے ہیں، اُن کو پہلے تو ثابت کرنا مشکل ہوتا ہے۔ ثابت ہو بھی جائیں، تو پچاس ساٹھ پونڈ سے زیادہ جرمانہ نہیں ہوتا۔ اور تو اور سرکار خود ستر لاکھ لوگوں کو نوکری دیتی ہے۔ حساب نہیں رکھ سکتی، کہ ستر لاکھ لوگوں میں سے کتنے کالے، کتنے گورے اور کتنے بھورے لوگوں کو کام دیا گیا ہے۔ پورے ملک میں جتنی نوکریاں ہیں، اُن کا تیسرا حصّہ نوکریاں خود سرکار کے پاس ہیں۔ ستر لاکھ۔ اگر تیسرا حصّہ نوکریوں میں رنگ بھید نہ رہے، تو باقی دو حصّوں میں بھی سدھار آئے۔ لیکن بلّی کے گلے گھنٹی کون باندھے؟ نیت صاف ہو، تو راستہ صاف ہے۔ مگر نیت تو صاف ہو۔

کل رات مار یہ سوزا ایک داستان سُنا رہی تھی۔ قصّہ ۱۹۰۵ء کا ہے۔ چتر کار وسلر نے اپنی پینٹنگ فروخت کی، دو سو گنی میں، اس زمانے کی دو سو گنی، یعنی آج کے لاکھوں روپے۔ ایک کریٹک نے اس پر مقدمہ دائر کر دیا، یہ چترکار دُنیا کو لوٹ رہا ہے۔ ایک پینٹنگ کی قیمت دو سو گنی؟ یا خُدایا!

عدالت میں مقدمہ پیش ہوا۔

جج نے پوچھا، واقعی یہ پینٹنگ تم نے دو سو گنی میں فروخت کی ہے؟

جی، می لارڈ! پوری دو سو گنی۔

مقدمہ کرنے والے کریٹک نے کہا، کورٹ سے، می لارڈ! رنگ کا ڈبہ پکڑ کر کینوس پر گرا دیا ہے، بس! اور دو سو گنی؟

جج نے وِسلر سے پوچھا، یہ پینٹنگ بنانے میں آپ کو کتنا وقت دینا پڑا؟

تقریباً تین گھنٹے، می لارڈ۔

تین گھنٹے کا کام اور دو سو گنی؟ جج بھی بے حد حیران ہو گیا۔

می لارڈ! بٹ اے لائیف ٹائم آف نالج واز بی ہائینڈ دو ز تھری آورز۔ وسلر نے کہا۔

وِسلر کو اس کے وقت کے ہر جانے کے عوض ایک فارذنگ کی ٹوکن پینلٹی دے کر اس کو باعزت بری کر دیا۔

لندن۔ تھیئٹر کی دنیا۔

دنیا بھر کے تھیئٹر کا مرکز۔

جس طرح پیرس چتر کلا کا مرکز ہے، جاپان الیکٹرانکس اور سنتھیٹک کپڑے کا اور کاروں کا، نیویارک آسمان کو چھونے والی عمارتوں کا، لاس ویگاز اور جاؤ ینٹ کارلو جوے کا مرکز ہیں، اسی طرح لندن تھیئٹر کا اور سنگیت کا مرکز ہے۔

آج کل اربنا اور میں جس لمبی چوڑی بلڈنگ میں رہ رہی ہیں، اس کے نچلے حصے میں ایک بڑی گیلری ہے، "اکتوبر گیلری" جس میں اربنا کی پینٹنگز کی نمائش لگی ہوئی ہے۔ پہلی چھت پر کلاکاروں کے رہنے کے لیے چھوٹے خوبصورت کمرے ہیں، جہاں چترکار اور تھیئٹر کے ایکٹر اور مصنف آ کر رہتے ہیں۔ اور دوسری چھت پر تھیئٹر ہال ہے، جہاں پر ڈرامے کھیلے جاتے ہیں، سنگیت کی محفلیں ہوتی ہیں۔ اور جب کچھ نہ ہو رہا ہو، تو کلاکار

گذارشیں کرتے ہیں، تاکہ جسموں میں لچک رہے۔

ہمارے پڑوس والے کمرے میں آج کل ایک تھیٹر کا۔ تقریباً پچاس سالہ فرینک۔ جو شکاگو سے ہر سال یہاں صرف تھیٹر دیکھنے کے لیئے آتا ہے۔ روز کا ایک تھیٹر سارا دن پڑھتا ہے، یا رات کو دیکھ چکے تھیٹر کے بارے باتیں کرتا ہے۔

پوری بلڈنگ میں عجیب وائبریشنز ہیں۔

جب شبلکشمی یہاں آئی تھی، اس سال کے شروع میں، انڈیا فیسٹیول کی اوپننگ میں گانے کے لیئے، تو ایک محفل اس بلڈنگ کے اوپر، سب سے اوپر والے تھیٹر میں بھی ہوئی تھی۔ گزشتہ سال برجو مہاراج یہاں ناچے تھے۔ ساری دنیا کے کلاکار یہاں آکر محفلیں لگا لگا جاتے ہیں، نمائشیں کر جاتے ہیں، ڈرامے کھیل جاتے ہیں۔

اسی طرح کے تھیٹر سارے لندن میں بکھرے پڑے ہیں۔

لیکن ہیا، مارکیٹ، لیسٹر سکوائر، شیفٹسبری ایونیو، چیرنگ کراس روڈ، یہ کوئی ڈیڑھ دو میل کا ایریا تو تھیٹر کا کعبہ ہے۔ تھیٹروں سے بھر کر کناروں سے باہر آرہا ہے۔

ویسے تو سارا دن ان سڑکوں پر لوگوں کے ہجوم چلتے رہتے ہیں۔ لوگ ہفتوں کے ہفتے پہلے ہی ایڈوانس بکنگ کروا لیتے ہیں، تھیٹر کی، لیکن شام کو سات بجے کے بعد تو میلہ لگ جاتا ہے۔ کار کوئی میل بھر دور پارک کر کے پیدل آنا پڑتا ہے۔ ڈرامے، میوزک کنسرٹ اور اوپیرا آٹھ بجے ساڑھے آٹھ بجے شروع ہو جاتا ہے۔

لندن میں تھیٹرز کی علیحدہ ایسوسی ایشن ہے، تھیٹر کے ایکٹروں کی ٹریڈ یونین ہے، اور ایکٹروں کا گرجا، جہاں تھیٹریکل پارٹیاں ہوتی ہیں۔

تھیٹر میں دنیا بھر کے مشہور سینما ایکٹر خاص طور سے کام کرنے آتے ہیں۔ گزشتہ برس نیویارک میں ایک ڈرامہ "دی لٹل فاکسیز" میں الزبتھ ٹیلر کام کر رہی تھی۔ گزشتہ ہفتے لندن

میں کھیلے جا رہے ہے مدی کنگ اینڈ آئی، میں یُل برائینز کام کر رہا تھا۔ تین سال پہلے لندن کے رائیل تھیٹر میں کھیلے جا رہے ہے واٹرز آف دی مُون، میں اینگرڈ برگ مین کام کر رہی تھی، جو تھوڑا عرصہ ہوا کینسر سے مر گئی تھی۔ آج کل لندن میں کھیلے جا رہے ایک ڈرامے میں گلینڈا جیکسن ایکٹ کر رہی ہے۔

اور بھی بہت سے ہالی ووڈ کے سٹار ہوں گے، جو کام کر رہے ہوں گے۔ لیکن میں نے صرف اُن ڈراموں کا ذکر کیا ہے، جو میں نے اور راج بپنا نے دیکھے ہیں۔

اور یہ ڈرامے کوئی ایک آدھ روز نہیں ہوتے۔ مہینوں کے مہینے چلتے ہیں۔ کئی دفعہ سالہا سال۔

یہ بات حیرانی کی ہے، کہ اپنی سینما کی مصروفیتوں کو ایک طرف رکھ کر کوئی اتنا بڑا مشہور اور مقبول ایکٹر مہینوں کے مہینے تھیٹر میں آکر کام کرتا رہے ہے۔

ایک دفعہ میں نے سوچا تھا، کہ دہلی میں پرتھوی راجکپور کا تھیٹر میلہ منایا جائے۔ جن ڈراموں میں وہ کام کیا کرتے تھے، وہی ڈرامے کھیلے جائیں۔ اُن کے بیٹے شمی کپور اور راجکپور اب اُن جیسے ہی معلوم ہوتے ہیں، وہ ان میں کام کریں، ششی کپور کرے۔ تینوں بیٹوں کو خط لکھے، جواب ابھی تک نہیں آیا۔

دوست کہتے تھے، تم مُورکھ ہو! اُن کو پارٹ کرنے کے لئے کیوں لکھا؟ صرف اوپننگ نائیٹ پر پانچ سات منٹ کے لیئے آجائیں، بس!

لیکن میرا مقصد تو پرتھوی راجکپور کے ڈراموں کو دوبارہ زندہ کرنے کا تھا، کوئی دکانداری چلانے کا نہیں تھا، کہ فلمی ستاروں سے ربن کٹواؤں۔ فلمی ستارے، یا سیاسی ستارے، یعنی نیتا لوگ! بے چارے!

کل رات کو ہم چیرنگ کراس روڈ کے وِنڈوم تھیٹر میں وائے سٹار از ٹارن،

دیکھا۔ اس ڈرامے کو ایک اکیلی عورت کا ڈرامہ کہا جا رہا ہے۔ ایک ہی اکیلی ایکٹرس 'رابن آرچر' پورا ڈرامہ کھیلتی ہے۔

یہ ڈرامہ پہلے ۱۹۷۹ء میں آسٹریلیا میں ملبورن میں کھیلا گیا تھا۔ پھر یہاں انگلینڈ میں سٹیفورڈ کے تھیٹر رائل نے اس کو پروڈیوس کیا۔ اس ڈرامے میں گیارہ گانے والی عورتوں کی زندگی اور کلا کو تاریخ کے دھندلکے اندھیروں میں لا کر سٹیج کی روشنی میں زندہ کیا گیا ہے۔ یہ گانے والی عورتیں اسٹیجوں پر گاتی تھیں، نائیٹ کلبوں میں گاتی تھیں۔ اُن کے گانوں کے ریکارڈ بنے ہوئے ہیں۔ ان گیارہ عورتوں میں سے نو عورتوں کی کلا بھی اور زندگی بھی حکایت بن گئی ہے۔ کیونکہ لوگوں کو اُن کی کامیابی اور کلا سے زندگی کا غم اور درد زیادہ یاد ہیں۔ باقی دو جین فورمین اور بیٹسی کلائین اپنی زندگی سے کافی مطمئن اور سکھی ہیں۔

ان نو عورتوں میں سے دو کنواری مر گئیں، اور باقی سات نے اٹھائیس شادیاں کیں، اور سب شادیاں ریت کے گھروں کی طرح ڈھیر ہو گئیں۔ صرف دو عورتوں نے بچے پیدا کیے۔

ان نو عورتوں میں سے صرف ایک پچاس کی عمر تک پہنچی، باقی سب چھوٹی عمر میں ہی مر گئیں۔

یہ نو عورتیں وہ ستارے تھے، جن کو کھینچ کر، توڑ کر، کانچ کی طرح ٹکڑے ٹکڑے کر دیا گیا۔ کیوں؟ کیونکہ جب وہ گاتی تھیں، تو اپنی آتما سے، اور اپنے جذبات سے، اور اپنی تنہائی سے اور اپنے درد سے سارے نقاب اُتار کر گاتی تھیں۔ اور ایک دفعہ جب اُن کے گیتوں کو سننے والے لوگوں نے اُن کی ننگی آتما کو دیکھ لیا، اُنہوں نے کبھی بھی دوبارہ ان کو ڈھانپنے نہیں دیا۔ اُن عورتوں کی مجبور کمزوری کے ساتھ کبھی بھی سننے والوں کے پیٹ نہیں بھرتے تھے۔ کیونکہ اس کمزوری کے مقابلے میں ہی وہ اپنے آپ کو مقابلہ کر کے طاقتور سمجھ سکتے تھے۔

'نہیں، اتنے ہی زخم کافی نہیں، اور دکھاؤ۔ ایک ورق آتما کا اور اُلٹو۔ ایک اور کھال اُتار کر ماس کو اُتارو۔ ہم کو زخم دیکھنے کی بھوک ہے، ننگے زخم، اور تازہ نیم گرم لہو۔'

ایک ایک چھلکا آتما سے اُترتا گیا، اور کھرچی ہوئی ننگی آتما آہستہ آہستہ فنا ہوتی گئی۔
اور سٹیج پر جلتی تیز، مدھم روشنیوں میں ایکٹرس رابن آرچر ان ساری عورتوں کو دوبارہ زندہ کر رہی ہے۔ وہ میری لائیڈ، کہ جو عجیب کپڑے پہنے رکھتی تھی، اور سر پر بڑے ٹوپ۔ وہ ہیلن مارگن کہ، جس کی نظروں میں سیکس تھا۔ وہ بیسی سمتھ، کہ جس کے کالے پہاڑ جیسے جسم میں سے سنگیت کی صاف شور والی آبشار گرتی تھی۔ وہ جوڈی گارلینڈ، کہ جس کی آواز کسی بھی ساز کی طرح سے زیادہ کانپتی تھی۔ وہ بلی ہالیڈے، کہ جو اپنے بالوں میں بائیں طرف گارڈینیا کے پھولوں سے بھری ٹہنی ٹانکے رکھتی تھی، اور جس کے بالوں کا رنگ خشک لہو جیسا تھا۔ وہ میرلن مزو، کہ جس کی آواز میں اور آنکھوں میں اور ہونٹوں میں ایک عجیب پیاس کی جھلک تھی۔ وہ ایڈتھ پیاف، کہ جس کی آواز میں گلیوں کی روح گونجتی تھی، گلیوں کی بھٹکی ہوئی آتما۔ اور جب وہ گاتی تھی، تو محسوس ہوتا تھا، بارش برس رہی ہے، جنگلی ہوا چل رہی ہے، اور چاند اپنی چاندنی کی ریشمی چادر بچھا رہا ہے۔ وہ بیٹسی کلائن، کہ جس کی آواز شہروں کے سٹیجوں پر بھی اپنے مضبوط دیہاتی پن کے ساتھ گونجتی رہی۔ وہ ڈائینا واشنگٹن، کہ جو گاتی تھی، تو سننے والوں کے جسموں پر بھکھڑا اگا آتی تھی، اور وہ جینس جوپلن، کہ جس کی آواز میں قہروں کا سوز تھا۔

رابن آرچر سٹیج پر کبھی کوئی ٹوپ پہن لیتی ہے، کبھی پھول ٹانک لیتی ہے، کبھی ربن گوندھ لیتی ہے، کبھی اپنے جنگلی بال کھول لیتی ہے، کبھی کس کر باندھ لیتی ہے، کبھی کوئی لہنگا پہن لیتی ہے، کبھی گاؤن۔ اور اس طرح وہ ان گیارہ عورتوں کو باری باری زندہ کرتی جاتی ہے۔

ساتھ صرف دو میوزیشن پیانو بجا رہے ہیں، سٹیج کے دھندلے حصے میں۔

اور دو گھنٹے بیت جاتے ہیں۔

تھیٹر سے باہر نکلتے ہوئے محسوس ہوتا ہے، ہم کسی اور صدی میں سے، کسی بیگانے وقت میں سے گزر کر آ رہے ہیں، جہاں بہت سارا درد تھا، بہت سے راز تھے، اور بہت ساری ظالم بے رحمی بھی تھی۔

پچھلے ہفتے ایک ڈرامہ دیکھا تھا، جس میں ایک ہندوستانی لڑکا، ایک ہندوستانی لڑکی اور ایک لڑکا کام کر رہے تھے۔ ولائیٹر راجہ، گاندھی بارے۔ گاندھی کا انگلینڈ پڑھنے کے لئے آنا۔ آہستہ آہستہ، شرماتے، جھجکتے ایک انگریز لڑکی کے ساتھ ناچنا، روٹی کھانا۔ آہستہ آہستہ انگریزی روایات اور طور طریقے سیکھنے۔ اور ہر وقت اپنی ماں کو دیئے قول کو یاد کر کے رُک جانا، شراب نہیں پیتی، گوری میم کے ساتھ کوئی گڑبڑ نہیں کرتی، گوشت نہیں کھانا اور پھر واپسی۔ ڈنڈی مارچ، ستیہ گرہ۔ اور ایک پُر امن تحمل مزاج طاقت بن کر ظلم کے ساتھ ٹکرانا۔

تینوں ایکٹر کبھی کوئی اور کبھی کوئی گاندھی بن جاتے تھے۔ سارا ڈرامہ ایک ہی سانس، ایک ہی ایکٹ میں کھیلا گیا۔

ڈرامہ کے طور پر کچا تھا۔ لیکن پھر بھی ہندوستانی کا لکھا ہوا ڈرامہ، ہندوستانی نقطۂ نظر سے۔ اور دیکھنے والے زیادہ انگریز۔ نیا تجربہ تھا۔

باربیکن کے 'پٹ' میں، یعنی بالکل گہرائی میں، نچلے گڑھے میں، گذشتہ ہفتے ایک ڈرامہ دیکھا۔ ہبسن کا 'ڈالز ہاؤس'۔

باربیکن کا پٹ۔ گراؤنڈ لیول سے پانچ منزل نیچے۔

باربیکن کیا ہے؟ پورا کلچرل شہر ہے۔ مختلف دنیا۔ صرف ریسٹورنٹ، اندرونی چھت والا ہال، بیرونی کھلا صحن، اور ساتھ فوارے، درخت پھول۔ دہلی کے کناٹ پلیس کے درمیانی لان کا نصف تو ضرور ہے۔ باربیکن کمپلکس کے آٹھ گیٹ ہیں۔ آٹھوں گیٹوں کا باہر سے اندازہ لگائیں، تو تقریباً ڈیڑھ میل کا رقبہ بنتا ہے۔ اس ڈیڑھ میل کے گھیرے کے اندر آرٹ گیلریاں، تھیٹرز، کانسرٹ ہال، موٹے قالینوں والے لاؤنج، سینما، کیفے۔ اور اوپر، اور آس پاس لوگوں کے رہنے کے لئے فلیٹس۔

نورا کی اداکاری کمال تھی۔ کس طرح ایک عورت ہمیشہ تیاگ کرتی، آہستہ آہستہ

موم بتی کی طرح پگھلتی پگھلتی آخر میں ایک لاٹ بن کر اونچی ہوتی ہے۔ اپنی ہی لاٹ کی روشنی میں اس کو اپنے آپ کا احساس ہوتا ہے، اپنے وجود کا، اپنی آئیڈنٹٹی کا، اپنی طاقت کا۔ طاقت جو مجبوری کی انتہا میں سے پیدا ہوتی ہے۔ اپنے آپ کا احساس، جو اپنے آپ کو بالکل بھول کر صرف دنیا کے سکھ کے لئے زندگی کے ریگستان میں بھٹکتا ہوا، اور اس ساری محنت اور ساری جدوجہد کے اچانک زیرو ہو جانے کے ساتھ جاگتا ہے۔ ایک نقطہ، جہاں پہنچ کر احساس ہوتا ہے، کہ آج تک کا سارا جینا ایک بیوقوف بھٹکن تھی، سراب تھا، جس کے پیچھے ایک اندھی دوڑی جا رہی تھی۔ بس! فل سٹاپ! رک جاؤ۔ اور مڑیں، دوسری طرف، الٹی سمت کی طرف۔ سورج کے بنڈر کو سورج، جو اپنی ہی چھاتی میں جلتا ہے۔

باربیکن کا یہ "گڑھا" گراؤنڈ لیول سے چھ منزل نیچے اُتر کر ہے۔ دھرتی کے گربھ میں۔

باربیکن کے اس گڑھے میں پہنچ کر امرتا پریتم کے بیٹے کی بڑودہ یونیورسٹی کا وہ کنواں یاد آتا ہے، جس کا ذکر امرتا کے ناول "جیب کترے" میں ہے۔ جس میں اُتر کر دوست لڑکے لڑکیاں شاعری پڑھتے ہیں، فلاسفی کی باتیں کرتے ہیں، اور زندگی کی۔

باربیکن کے وسیع کلچرل کمپلیکس کے گڑھے یعنی "ڈیپٹ" میں ایک تھیٹر ہے، اور ایک سینما۔

سینما میں کسی نہ کسی عظیم فلم ڈائریکٹر کے پورے شاہکاروں کا میلہ لگا رہتا ہے۔

آج کل وہاں ووسکونٹی، جس کو وہاں کے لوگ وائیکونتی، بھی کہتے ہیں، کی فلموں کا میلہ لگا ہے۔ آج رات کی فلم تھی "سنیفسو" بڑی امید سے وسکونٹی کی یہ فلم دیکھنے گئی، کہ کچھ نیا ہو گا، بات نئی ہو گی، بات کہنے کا انداز نیا ہو گا۔ لیکن فلم اپنی ہندی فلموں جیسی لگی۔ گزشتہ صدی کا اٹلی، اٹلی پر آسٹریلیا کا قبضہ، اٹلی کی جنگِ آزادی کی جدوجہد، آزادی کے دیوانوں کے لئے جیلیں، کال کوٹھڑیاں۔ آزادی کے ان دیوانوں میں سے ایک، جو سب سے زیادہ مقبول تھا، محبوب تھا، اس کی بڑی پیاری سی کزن، جس کے ساتھ رشتہ محبوب دوستوں جیسا تھا۔ یہ کزن بہت خوبصورت تھی، اور جوان، لیکن ایک بوڑھے کاؤنٹ

کے ساتھ بیاہی ہوئی تھی۔ اس لیئے ایک عجیب سی بے چینی تھی اس کی طبیعت میں۔ اپنے باغی کزن کو بہت پیار کرتی تھی۔ کزن پکڑا گیا، اور اس کو ایک سال کے لیئے جلاوطن کر دیا گیا۔ کزن کی سزا معاف کرانے کے لیے جب یہ بھٹک رہی تھی، تو ایک آسٹرین لیفٹیننٹ سے عشق کر بیٹھی۔ یعنی دشمن کے ساتھ۔ آزادی کی لڑائی کے لیئے بڑی مشکل کے ساتھ جمع کیئے ہوئے جو پیسے، لوگوں کی پونجی، اس کے کزن نے اس کے پاس رکھی ہوئی تھی، وہ مہروں کی تھیلی ساری کی ساری اس نے اس آسٹرین عاشق کو دے دی۔ عشق میں اندھی ہوئی نے اپنے لوگوں کے سپنوں کو فروخت کر دیا۔ اور پیسے نہ ہونے کی وجہ سے، علاج کے نہ ہونے، روٹی اور گولہ بارود کے نہ ہونے کی وجہ سے جب آزادی کی جنگ کے دیوانے سڑکوں پر مر رہے تھے، وہ گھر بار چھوڑ کر اس عاشق کی طرف چل دی۔ عاشق کے گھر پہنچی، تو وہ اپنی نئی محبوبہ کے ساتھ مست تھا۔ بعد میں حسد میں پاگل ہوئی نے اس محبوبہ کو مروا دیا" اور خود گلیوں میں بھٹکنے لگی۔

ہم ہمیشہ یہ سمجھتے ہیں، کہ مغربی ڈائریکٹر جو فلمیں بناتے ہیں، وہ بس ماسٹر پیس ہوتی ہیں، سب کی سب۔ مغربی لوگ جو کچھ بھی کرتے ہیں، وہ سارا عظیم ہوتا ہے۔ لیکن بات یوں نہیں ہوتی دوستو! صرف یہاں آکر پتہ چلتا ہے، یورپ میں انگلینڈ میں، امریکہ میں بھی گھٹیا فلمیں بنتی ہیں، گھٹیا پینٹنگز بھی بنتی ہیں، گھٹیا کتابیں بھی شائع ہوتی ہیں، گھٹیا شاعری بھی ہوتی ہے۔ اور زندگی بھی کئی دفعہ گھٹیا بسر کی جاتی ہے۔

سب کچھ نہ کہیں بڑھیا ہوتا ہے، اور نہ ہی کہیں سب کچھ گھٹیا ہوتا ہے۔

بلکہ یہاں جس طرح فارمولا کتابیں لکھی جاتی ہیں، وہ تو کمال ہی ہے۔ ایک عورت گھر روٹیاں پکاتی اور بچے پالتی تھک جاتی ہے۔ بچے بڑے ہو کر مصروف ہو گئے۔ وہ بور ہوتے ہوتے سوچنے لگی، کیوں نہ ایک کتاب ہی لکھ ماروں؟ ایک کاغذ پکڑا۔ تین لائینوں میں

کتاب کی آؤٹ لائن کا تانا بانا لکھ لیا۔ لکھ کر فارمولے کے ایکسپرٹ کے پاس گئی۔ اُس نے وُہ کاغذ دیکھا، تین لائنیں پڑھیں، کافی کے دو پیالے پیتے پیتے سوچا، تین کے ساتھ تیرہ چودہ لائنیں اور جوڑ دیں۔ یعنی اُن تین لائنوں کے "آئیڈیے" کو پھیلا کر سولہ لائنوں کا کر دیا۔

گھر روٹیاں پکانے والی عورت نے چھ ماہ بیٹھ کر کتاب لکھ دی۔

کتاب چھپی۔

کریٹکس سے اچھے، سینسیشنل لکھوائے گئے ریویو۔

کتاب دھڑا دھڑ بکنے لگی۔

اب تک کتاب کی تیس لاکھ کاپیاں بِک چکی ہیں۔

کتاب کا نام "سُپر وُومین"!

کتابیں خاص کر فارمولا کتابیں، یہاں پر موسم کے حساب سے شایع کی جاتی ہیں۔ گرمیوں کی چھٹیوں میں جب لوگ گھروں سے نکل پڑتے ہیں، چھٹیاں منانے یورپ جاتے ہیں، دُور دراز سفر پر جاتے ہیں، اس وقت یہ کتابیں ہر اسٹیشن پر، ہر ائیرپورٹ پر، اور ہر جہاز اور ہر بندرگاہ پر موجود ہونی چاہئیں۔ چھٹیوں سے کچھ دیر پہلے اخباروں میں شاندار ریویو چھپوائے جاتے ہیں، اور عین چھٹیوں کے موقعے پر لاکھوں کی تعداد میں یہ کتابیں ہر سٹال پر پھیلا دی جاتی ہیں۔ پیپر بیک میں۔ اور لوگ ان کو ریوڑیوں کی طرح خرید کر لے جاتے ہیں، سفر میں پڑھنے کے لیئے۔

چمن لال چمن، جس کی ساری زندگی ریڈیو سے وابستہ رہی ہے۔ پردیسوں میں ریڈیو پر ہندوستانیوں کے لئے ریڈیو پروگرام پیش کرنے کے لیئے، پہلے کینیا اور پھر لندن میں۔ وُہ آج کل ایک انٹرکلچرل کمیونٹی سنٹر چلانے میں مصروف ہے، ہنسلو میں۔ یہ سنٹر دکھانے کے لئے وُہ مجھے اور ارپنا کو لے گیا۔

ہم وہاں پہنچے، تو دوپہر کے کھانے کا وقت تھا۔

لنگر کی طرح قطاریں باندھ کر ہندوستانی اور انگریز مرد اور عورتیں بیٹھی تھیں، لمبے بینچوں پر، اور روٹی کھا رہے تھے، اپنی اپنی پلیٹیں ہاتھ میں پکڑ کر۔ چمن بتانے لگا، کہ اس ہال میں پہلے کرسیاں میز بچھائے گئے تھے۔ لیکن جب لوگوں کی بھیڑیں اس طرح اکٹھی ہونے لگ گئیں، تو جگہ کی کمی کی وجہ سے میز ہٹا دیئے گئے، اور لمبے بینچ بچھا دیئے گئے۔

آنکھوں میں شرارت اور چمک۔ اور وہ بتا رہا تھا، کہ بس جی، اب گوروں کو اپنی روٹی مزہ نہیں دیتی۔ پہلے ہم روزانہ بدل بدل کر روٹی بناتے تھے، انگلش لنچ، سکاچ لنچ، ساؤتھ انڈین لنچ، پنجابی لنچ۔ انگلش اور سکاچ لنچوں والے دن یہاں مکھیاں بھی نہیں آتی تھیں۔ اور پنجابی لنچ والے دن لوگ ساڑھے بارہ بجے ہی آ کر اپنی جگہ مل کر بیٹھ جاتے ہیں۔ جتنی مرضی ہے، کھانا تیار کر لیں، ختم ہو جاتا ہے، ہمارے لیئے بھی نہیں بچتا۔

اور واقعی ہر ہندوستانی ریسٹورنٹ میں انگریز مرد عورتوں کی بھیڑ ہوتی ہے۔ صرف یہی نہیں، لوگ گھروں میں بھی ہندوستانی طریقے کی چکن کری اور گوشت بنانے لگ گئے ہیں۔ صرف روٹی بیلنی انگریز عورتوں کو مشکل لگتی ہے۔

ہم جہاں رہ رہے ہیں، 'اکتوبر گیلری' کے اوپر، اس کی مینجر امریکن لڑکی ہے۔ ویسے بھی یہاں شکاگو، میکسیکو، فرانس، نیویارک سے لوگ آئے ہی رہتے ہیں۔ ان کے انسٹیٹیوٹ آف ایکوٹیکنکس، کے ممبر، ڈائریکٹر اور دوسرے لوگ۔ جو یہاں کھانا پکتا ہے، اس میں ہندوستانی مصالحے ضرور پڑتے ہیں، زیرہ، دھنیا، لونگ، تیز پتے، دال چینی، الائچی۔ اور سب ان مصالحے والی چیزوں پر فدا ہیں۔ لال مرچوں کا برا مرتبان بھی رکھا ہوا ہے، باورچی خانہ میں، جو باقاعدگی سے استعمال کیا جاتا ہے۔ اور مرتبان پر لیبل ہے، 'ریڈ پیپریکا'۔

تو انگریز مصالحے والے مرغے کھا رہے ہیں، اور انگریز عورتیں ہندوستان سے آئی گھگریاں پہن رہی ہیں۔

جب انگریز ہندوستان میں تھے، تو ہم نے ان کی انگریزی سیکھی تھی۔ ان کے شیکسپیئر، بائیرن، کیٹس اور شیلی کو پیار کرنا سیکھا تھا، ان کی پتلون پہننی اور ٹائی لگانا سیکھا تھا۔ تاریخ کا پہیہ گھوم رہا ہے۔ اب یہ ہمارے مصالحے والے مرغے اور پلاؤ کھانے سیکھ رہے ہیں۔ اور ان کی عورتیں ہندوستانی بلاؤز اور گھگریاں پہن کر گھوم رہی ہیں۔

گریٹ برٹن کی آرٹ کونسل، سارے تھیٹروں کو گرانٹس دیتی ہے۔ ہر سال اسّی کروڑ پونڈ، یعنی اسّی کروڑ سے تقریباً بیس گنا روپے آرٹ پر خرچ کیئے جاتے ہیں۔ برٹن میں تقریباً بارہ سو پروفیشنل آرگنائیزیشن ہیں، جن کا تعلق آرٹ سے ہے۔ آرٹ یعنی کلا کا ہر میدان۔ اور یہ بارہ سو آرگنائیزیشنز آرٹ کونسل کی گرانٹ پر چلتی ہیں۔ ایک سو ساٹھ کے قریب تھیٹر کمپنیوں کو، اوپیرا کمپنیوں اور آرکیسٹرا گروپوں کو، ڈانس کے گروپوں کو، میوزک اور جیز کے گروپوں کو، چتر کلا اور فوٹو گرافی کی گیلریوں کو، چھوٹے لٹریری میگزینوں کو، پبلشرز کو، اور کتابوں کی دوکانوں کو، آرٹ سینٹرز کو اور کیمونٹی آرٹ پراجیکٹس کو ہر سال یہ گرانٹ تقسیم کی جاتی ہے۔

اس کے علاوہ آرٹسٹوں کو، مصنفوں کو، میوزک کمپوزروں کو بھی آرٹ کونسل گرانٹ دیتی ہے۔

اگر کسی تھیٹر کمپنی نے لندن سے سکاٹ لینڈ جا کر ڈرامہ کرنا ہو، یا ملک کے کسی بھی کونے میں، تو اُن کے سفر کا اور ٹور کا خرچ بھی آرٹ کونسل کرتی ہے۔

سکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں آرٹسٹوں اور مصنفین کو بُلا کر کچھ مہینوں کے لیئے یا پورے سال کی ٹرم کے لیئے، رکھنے کے لیئے ریزیڈنسی سکیمیں ہیں۔ اور ان سکیموں کو بھی آرٹ کونسل مدد دیتی ہے۔

انگلینڈ کے مختلف حصّوں میں بارہ ریجنل آرٹس ایسوسی ایشنز، ہیں، جو آرٹ کونسل

کی گرانٹ سے چلتی ہیں۔

یعنی اگر امرتا پریتم انگلینڈ جیسے ملک میں ہوتی، تو بطور مصنفہ کے پورے سال کا، روٹی پانی کا، ٹریول کا، کتابوں کا خرچ کونسل نے دینا تھا۔ چھوٹے موٹے مصنف کو تقریباً ایک ہزار پونڈ یعنی کوئی بیس ہزار روپیہ سالانہ ملتا ہے، امرتا کو کم از کم اسی ہزار ملتا۔

اور امرتا کے میگزین ‘ناگ منی’ کو چلانے کے لئے بھی آرٹ کونسل پیسے دیتی۔

امروز کو علیحدہ گرانٹ ملتی، کلاکاروں والی، اور امروز کے ناگ منی پر کاش کو علیحدہ۔

اور گھر کے نچلے حصے میں اگر سیلی یا کندلا کتابوں کی چھوٹی سی دوکان کھول لیتے، تو اس دوکان کو چلانے کے لئے علیحدہ گرانٹ ملتی۔ کیونکہ اس پورے ایریا میں، بلکہ پوری ساؤتھ دہلی میں کوئی پنجابی کی کتابوں کی دوکان ہے ہی نہیں۔ ایسی دوکان کو ساؤتھ دہلی میں رہنے والی کمیونٹی کی خدمت سمجھا جاتا۔

اس کا یہ مطلب نہیں، کہ انگلینڈ میں بہت پیسہ ہے، یعنی پیسوں کا مینہ برس رہا ہے، چلو کلا پر بھی دل کھول کر خرچ کر دو۔

انگلینڈ کی اکانومی بھی ہمارے ملک کی طرح ڈانواں ڈول ہے۔ بے روزگاری ہے، چیزوں کی قیمتیں آسمان کو چھو رہی ہیں، ہڑتالیں ہوتی ہیں، لاک آؤٹ ہوتے ہیں، اور اوپر سے ڈپریشن کے بھی بادل گھر کر آرہے ہیں۔

لیکن کلا پر پیسہ خرچ کرنا، نہایت ضروری اخراجات میں شمار کیا جاتا ہے۔ کیونکہ یہ مان کر چلا جاتا ہے، کہ کلا زندگی کی کوالٹی کو بہتر کرنے کے لئے ہوتی ہے۔

اور زندگی سب سے ضروری چیز ہے۔

بات مہنگائی کی ہو رہی تھی۔ مہنگائی ہے، کہ توبہ!

پینسل کا ریفل ۔؍۳ سات روپے کا۔ آرڈ فین روپے کا۔ کیلا دو روپے کا۔ ایک پاؤ دہی دس روپے کا۔ بس یا ٹیوب میں تقریباً دو میل کا سفر دس روپے کا۔ ایک ٹکڑا ڈبل روٹی کا دو روپے کا۔ کوکا کولا کا چھوٹا گلاس چھوٹے سے ہوٹل میں سات روپے کا۔ بڑے ریسٹورنٹ میں خدا کا نام! سر درد کی گولی ایک روپے کی۔ سستے سے سستا بال پوائنٹ پین سات آٹھ روپے کا۔ ہندوستان کو لکھی چٹھی پر ٹکٹ پانچ روپے کا۔ تھیٹر کی سستی سے سستی سیٹ تقریباً اسی روپے کی۔

یعنی اگر ارپنا اور میں تھیٹر جائیں، تو آنے جانے کا کرایہ ملا کر کوئی دو سو روپے کے قریب خرچ آتے ہیں۔

اور جس دن ہم نے تھیٹر جانا ہوتا تو اس دن ہم کھانا نہیں کھاتے تھے۔ ایک وقت کا کھانا نہ کھائیں، تو ساٹھ ستر روپے بچ جاتے ہیں۔ روٹی یعنی بالکل غریبوں والی، مزدوروں والی روٹی۔

ابھی ابھی یہاں ایک قانون پاس ہوا ہے، جس کا نام ہے، پی۔ ایل۔ آر، یعنی پبلک لینڈنگ رائیٹس، سوسائٹی آف آتھرز نے ۱۹۵۲ء میں یہ جدوجہد کی تھی، کہ سکینڈے نیویا کی طرح یہاں بھی قانون بننا چاہیئے، کہ جس مصنف کی کتابیں لائبریریوں میں ہوں، ان کتابوں کو سال میں جتنی دفعہ بھی لوگ ایشو کرائیں، اس کے پیسے مصنف کو بھی ملنے چاہئیں۔ کیونکہ اگر وہ کتاب لائبریری میں نہ ہوتی، تو پڑھنے والے خرید کر پڑھتے۔ لائبریری میں سے جتنے لوگوں نے وہ کتاب لے کر پڑھی، اتنی ہی اس کتاب کی سمجھیں، کہ بکری کم ہو گئی، اس کا ہرجانہ مصنف کو کیوں نہ ملے؟

تیس سال کے بعد قانون پاس ہو گیا ہے، کہ ٹھیک ہے، کہ مصنف کو پیسے ملنے چاہئیں۔ ہر ایشو کی آدھی پینی، یعنی تقریباً دس پیسے۔

انگلینڈ میں کم از کم پانچ ہزار لائبریریاں ہیں، بلکہ زیادہ ہی ہوں گی۔ ہر لائبریری میں اگر دو دو چار چار کتابیں بھی ہر مصنف کی ہوں، اور ہر کتاب سال میں اگر بیس دفعہ بھی جاری ہو، تو چالیس ہزار روپے مصنف کے بنتے ہیں۔ لیکن قانون میں یہ بھی شامل ہے، کہ کسی مصنف کو زیادہ سے زیادہ پانچ سو پونڈ، یعنی کوئی نو دس ہزار روپے ہی مصنف کو مل سکیں گے۔ زیادہ نہیں۔

لیکن یہ پیسے صرف اُن مصنفوں کو ہی ملیں گے، جو انگلینڈ میں رہتے ہوں گے۔

یہ اب ہندوستان کے گجراتی، پنجابی، ہندی اور اردو کے مصنفین پر منحصر ہے، کہ وہ کسی طرح اپنی ادبی اکیڈمی کے ذریعے یا آتھرز گلڈ، یا کسی اور طریقے کے ذریعے انگلینڈ کی سرکار پر دباؤ ڈالیں، کہ اس قانون میں اُن کی کتابیں بھی شامل ہونی چاہئیں، کیونکہ سرون چندن کہتا ہے، جو خود یہاں آکسبرج لائبریری میں لائبریرین ہے، کہ یہاں گجراتی، پنجابی، ہندی اور اردو کی کتابیں لائبریری کے ذریعے بہت پڑھی جاتی ہیں۔

ٹیمز کا پار والا کنارہ۔

وسیع ..... نیشنل تھیٹر۔

اصل میں نیشنل تھیٹر کے اندر تین تھیٹر ہیں۔ ایک ہی بلڈنگ میں۔ کیفے، بار، لاؤنج۔

رونقیں۔

ہجوم۔

ہر صبح تینوں تھیٹروں میں چل رہے، تینوں ڈراموں کے لئے علیحدہ علیحدہ قطاریں لگتی ہیں۔

ویسے تو نیشنل تھیٹر کی ٹکٹوں کی کئی ہفتے پہلے ہی ایڈوانس بکنگ ہو جاتی ہے، مگر ہر روز وہ تقریباً پچاس ٹکٹیں فروخت کرتے ہیں۔

تینوں کھڑکیاں دس بجے کھلتی ہیں۔ لوگ صبح سویرے ہی باہر کمبل بچھا کر، نیچے رکھ کر، سٹول رکھ کر، یا ویسے ہی زمین پر، سیڑھیوں پر قطاروں میں بیٹھ جاتے ہیں۔

ہر شخص کو دو سے زیادہ ٹکٹ نہیں ملتے۔

نیشنل تھیٹرز کے لٹلٹن تھیٹر میں آسکر وائلڈ کا "ایمپارٹنس آف بینگ ارنیسٹ"، سوموار کو دیکھا۔

پہلے ہفتے کے روز ٹکٹ لینے گئی۔ سوچا دس بجے کھڑکی کھلتی ہے، ساڑھے نو بجے لائن میں جا کر کھڑی ہو جاؤں گی۔ لیکن ساڑھے نو بجے تک لائن کوئی دو فرلانگ لمبی ہو چکی تھی۔

ٹکٹ نہ ملنا تھے، نہ ملے۔

سوموار کو صبح آٹھ بجے جا کر لائن میں بیٹھ گئی۔ مجھ سے پہلے بھی پانچ سات لوگ آئے بیٹھے تھے۔

مجھ سے پہلے ایک لڑکی بوری کا تھیلا اپنے نیچے بچھا کر بیٹھی تھی۔ چائے لینے کے لئے گئی، تو مجھے اپنے تھیلے کا خیال رکھنے کو کہہ گئی۔ تھیلے پر لکھا تھا، اجنتا۔ پھر ایک ہاتھی کی تصویر تھی۔ اور اس کے نیچے لکھا تھا، فلاڈیلفیا امریکہ۔ اس لئے یہ لڑکی شائد فلاڈیلفیا سے آئی ہو گی، سیر کرنے کے لئے۔ اور وہاں شائد کوئی اجنتا نام کی ہندوستانیوں کی دوکان ہو گی، جہاں سے اس نے کوئی گھگری خریدی ہو گی، یا بلاؤز یا شائد چائے کا ڈبہ۔

میرے ساتھ شکاگو سے آیا پروفیسر فرینک ہے۔ وہ اپنے تھیلے میں ہمیشہ دو سٹول رکھتا ہے، جو تہہ ہو کر بالشت برابر ہو جاتے ہیں۔ وزن بمشکل پاؤ بھر۔ میں اور فرینک، ان چھوٹے سٹولوں پر بیٹھ کر کھڑکی کھلنے کا انتظار کرتے رہے۔

اور شام کو محنت سے کمائے ٹکٹوں کی وجہ سے ڈرامہ دیکھا۔

آسکر وائلڈ کیا پکچر آف ڈورین گرے آ، میں اور پھر جیل سے لکھی چٹھیوں اور ڈائریوں میں بالکل اور موڈ ہے، ڈراموں میں بالکل اور۔

اتنے چست فقرے، تیکھا طنز! چاقو کی طرح کاٹتا تمسخر۔ اور ہر لفظ جیسے چھیل چھیل کر تیکھا کیا گیا ہو، تیر کی نوک جیسا۔ کہیں کچھ نہ فالتو، نہ کم۔

اور سیٹ! ماشاء اللہ! تین ایکٹ، اور تینوں ہی سیٹ! اتنے وسیع سیٹ۔ مگر ہر چھوٹی سی چھوٹی ڈیٹیل بھی بڑی سوجھ بوجھ سے تراشی ہوئی، بڑی منصوبہ بندی سے۔

سارے سیٹ نیشنل تھیٹرز کی ورکشاپ میں ہی تیار کیے جاتے ہیں۔

ایک اور لطف کی بات یہ ہے، کہ صبح سویرے فقیروں کی طرح سیڑھیوں پر بیٹھ کر ٹکٹیں لینے والوں کو سیٹیں سب سے اگلی قطار میں ملتی ہیں۔

اور پہلی دفعہ سب سے اگلی قطار میں بیٹھ کر ڈرامہ دیکھا۔ دہلی میں صرف سری رام تھیٹر کے بیسمنٹ تھیٹر میں کیونکہ پہلے آنے والے لوگ سب سے اگلی قطار میں بیٹھ سکتے ہیں۔ اس لئے کبھی کبھی آگے بیٹھ جانے کا موقعہ مل جاتا ہے۔ ورنہ ہمیشہ صرف پانچ روپے والی ہی ٹکٹ لیتی ہوں، اور چھٹی، ساتویں قطار سے آگے بیٹھنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

یہاں پر چاہے سب سے سستا ٹکٹ تقریباً ستر روپے کا تھا، لیکن شو والے دن ہی صبح پچاس سیٹیں جو فروخت ہوتی ہیں، وہ سب سے آگے والی، شاندار قطار میں۔

نیشنل تھیٹرز کے چھوٹے تھیٹرز میں، 'بے غرض بیگانہ'، دیکھا۔

بہت عرصہ پہلے القاضی کا ڈائریکٹ کیا ہوا ڈرامہ 'یرما'، دیکھا تھا، اس کی دیہاتی لڑکیاں ندی پر کپڑے دھوتیں، چغلیاں کھاتیں، چیخیں مارتیں! اور ہنستیں، یاد آگئیں۔ اور یاد آئی، بھکاریوں کی بھیڑ، جو بلونت گارگی کے ڈرامے 'رضیہ سلطان'، میں تھی۔ جو القاضی نے ڈائریکٹ کیا تھا۔

کمال کے لباس! کمال کے تہہ اندر رے، کمال کے میلے، رف، ان ملجھے چہرے۔
اور کمال کی ایکٹنگ!

اور وقفہ وقفہ سے سیاست پر تیکھا طنز۔

اور نیشنل تھیٹر کے بڑے تھیٹر میں وآپ سٹریم، ڈرامہ ہو رہا ہے۔ سٹیج پر ایک دریا ہے، اور دریا میں سٹیمر، جو دریا کے چڑھتے طرف چل رہا ہے۔ اور سٹیمر میں ڈرامہ چل رہا ہے۔

یہ سیٹ پہلے چھتیس ہزار پونڈ یعنی کوئی سوا سات لاکھ پونڈ کی لاگت سے تیار کیا گیا۔ جس دن پریویو ہونا تھا، اس دن پتہ لگا، کہ سیٹ ٹھیک طرح سے فنکشن نہیں کر رہا۔ کئی بجلی کے اور الیکٹرک آلے تھے، جو ٹھیک نہ چلے۔ اس لیئے ڈرامہ کو پوسٹ پون کر دیا گیا۔

ایک مہینہ اور لگا۔ ہزاروں پونڈ اور خرچ کیئے گئے۔ سیٹ درست کیا گیا، اور اب ڈرامہ کھیلا جا رہا ہے۔

یہ پہلی بار ہے، کہ میں نے سٹیج پر دریا کو بہتے دیکھا ہے، اور اس میں چلتا ہوا اسٹیمر۔

پتہ ہوتا ہے، کہ سب آنکھ کا بھلیکھا ہے۔ اصل میں سٹیج بھی ساکن ہے، اور ہم بھی وہیں بیٹھے ہیں، لیکن پھر بھی بھلیکھا پڑ رہا ہے۔ بس یہی کمال ہے۔

بڑے عرصے کے بعد رو کر آئی ہوں۔

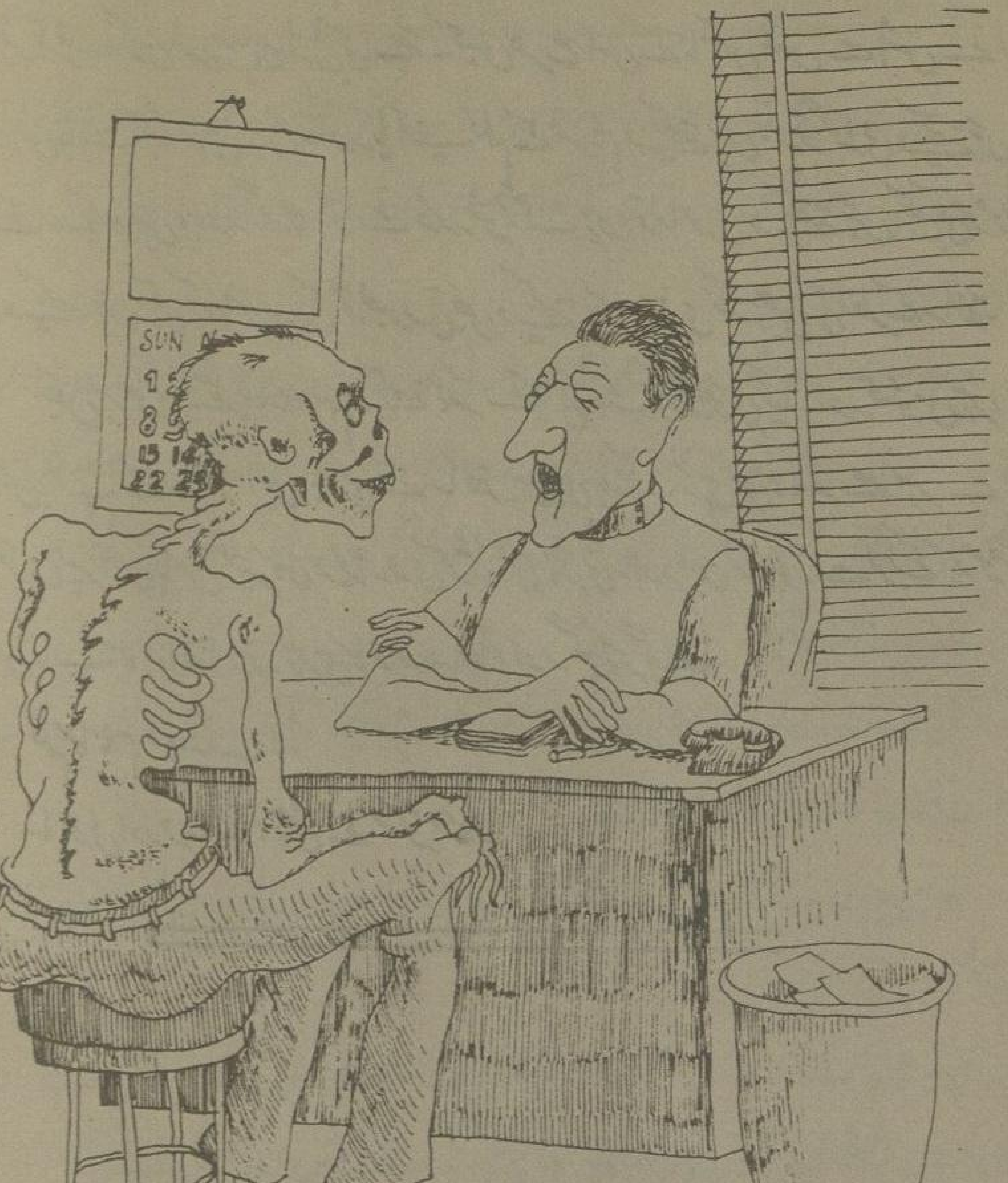
پورے ہال میں حسبِ معمول تین چار آدمی تھے۔ اور ہال کے درمیان اندھیرے میں بیٹھی میں سسک سسک کر رو رہی تھی۔

بھول گئی تھی، کہ یہ محض فلم ہے۔ خالی پردے پر چل رہی تصویروں کھیل سینما!
یہ بھول گیا، کہ ایکٹر کی، جیک لیمن کی اور سمی سپیلک کی یہ ایکٹنگ ہے۔

ہوتا عموماً یہ ہے، کہ فلم دیکھتے آپ اس کی نازک مومینٹس کو دیکھتے ہیں، کہ ڈائریکٹر نے کس طرح ہینڈل کیا ہے۔ کس طرح اس نے نامکمل لمس سے اس نے، خاموش بات کہہ دی ہے۔ اور یا آپ فلم کے فریم دیکھتے ہیں، فوٹو گرافی دیکھتے ہیں، سیٹ دیکھتے ہیں، اور اگر پھر آؤٹ ڈور شوٹنگ ہو، تو ماحول دیکھتے ہیں، کبھی کبھی خوبصورتی بھی دیکھتے ہیں، کبھی کبھی سین کی خوبصورتی بھی دیکھتے ہیں، بڑی نکتہ چینی کی نظر کے ساتھ۔

لیکن برسوں کے بعد یہ فلم دیکھتے ہوئے باقی سب کچھ بھول گیا۔ اور محسوس ہوا، کہ اس باپ کے ساتھ، اس بیوی کے ساتھ میں بھی بھٹک رہی تھی، اندھے بہرے راستوں پر آس پاس تعمیر کالی دیواروں کو ٹٹولتی ہوئی۔ اور اس خوبصورت لڑکے کو ڈھونڈتی جو اس باپ کا بیٹا تھا، اس بیوی کا خاوند تھا، اور گم ہو گیا تھا۔

فلم کا نام "میسنگ"؛
ماحول اور زمانہ، چلی سے دکھ، کا۔



رنگدار لوگوں کو انگلینڈ میں کام ملنے کے کم امکانات ۔ ایک خبر ۔

وہ لڑکا، چارلی، اور اس کی بیوی دونوں امریکن ہیں، لیکن چلّی میں رہتے ہیں۔ ان کو وہ ملک پسند ہے۔ چارلی بچوں کے لیئے کتابیں لکھتا ہے، اور اُن کو السٹریٹ کرتا ہے۔ بی بی بلّخ گھگری پہن کر چلتی ہوئی۔ مگر مچھ چوغہ پہن کر ڈگڈگی بجاتا ہوا۔ اور بچوں کی کہانیاں ایک اخبار کو بھی دے دیتا ہے، جو یوں تو بائیں بازو کا اخبار ہے، مگر بچے نہ بائیں بازو کے ہوتے ہیں، نہ دائیں بازو کے، وہ تو محض بچے ہی ہوتے ہیں۔
دکو، سے دو چار دن پہلے، چارلی اپنی بی بی کی دوست کے ساتھ کسی کیفے میں بیٹھا تھا، کہ قریبی میز پر بیٹھے کسی آدمی سے اس نے اخبار مانگا۔ وہ آدمی فرینچ تھا، کوئی فوجی جرنیل۔ بات چیت ہونے لگی، دوستی ہو گی۔ کہنے لگا، ہماری نیوی کے کئی جہاز یہاں آگئے ہیں۔

کیوں؟ کیا کرنے؟

پتہ نہیں۔ ہم کو امریکن فوج کی کمانڈ میں کام کرنے کا حکم ہے۔

امریکن فوج؟

ہاں، بہت ساری فوج، ایئر فورس اور نیوی یہاں آئی ہے، امریکن۔

مگر کیا کرنے؟

پتہ نہیں۔

اور دو دن بعد "کو" ہو گیا، کیمونسٹ سرکار کے خلاف۔ قیامت! قہر!

کرفیو!

لوگوں کو اس طرح قتل کیا جانے لگا، جیسے مکھیاں ماری جاتی ہیں۔

لوگ ڈر سے کانپ رہے ہیں، بھاگ رہے ہیں، چھپ رہے ہیں، اور گولیوں سے بھونے جا رہے ہیں۔

سڑکوں پر، فٹ پاتھوں پر، کھیلوں کے سٹیڈیموں میں، بسوں میں، گلیوں میں، ہر جگہ لاشیں پڑی ہیں۔

چارلی کے دو دوستوں کو، جو اسی اخبار میں کام کرتے ہیں، فوجی سپاہی پکڑ کر لے گئے ہیں۔ اُن میں سے ایک کی بیوی، جو بیمار تھی، پریگنینٹ تھی، کو چارلی کی بیوی تسلّی دینے کے لیئے گئی۔ واپس لوٹتے ہوئے اُس کو نہ بس ملی، نہ ٹیکسی، اور کرفیو لگ گیا۔ ساری رات وہ کسی گیٹ کے پیچھے دبکی ہوئی فوجی جیپوں کو گولیاں برساتے، اور گیٹ کے قریب سے گزرتے ہوئے دیکھتی رہی، اور کانپتی رہی۔

گھر آئی، تو گھر اُجڑا پڑا تھا۔ سب کچھ ٹوٹا پھوٹا پڑا تھا، اور چارلی نہیں تھا۔

اور پھر امریکہ سے چارلی کا باپ آ گیا۔ گمشدہ بیٹے کو تلاش کرنے کے لیئے۔

اور شروع ہوئی ایک اندھی بہری دوڑ۔ جو اندھیروں میں سے اندھیروں تک جاتی تھی۔ آس پاس چل رہی گولیاں۔ سڑکوں پر پڑی لاشیں۔

ہوٹلوں میں ہو رہے ڈانس اور میوزک۔ کیونکہ کسی فوجی نے کسی بڑے ہوٹل میں قدم نہیں رکھا۔ ہاں، جب کوئی باہر سے آ کر کسی ہوٹل میں چھپ جاتا تھا، جس پر اُن کو کیمونسٹ یا بائیں بازو یا پہلی سرکار کے حمایتی ہونے کا شک ہوتا تھا، تو خاموشی

سے، تاکہ باقی لوگوں کے چین آرام میں خلل واقع نہ ہو، اگر اُس کو لے جاتے تھے۔

اور بار بار دونوں چارلی کی بیوی اور رباپ امریکن ایمبیسی میں جاتے ہیں۔ بار بار رباپ گڑگڑاتا ہے، ہی اِز مائی اونلی چائیلڈ۔ بار بار چکنے چہروں والے لوگ چکنی مسکراہٹوں سے کہتے ہیں، وُی آر ڈوئنگ آر بیسٹ۔

کبھی اُس کو کہتے ہیں، کہ ہم کو خبر ملی ہے، کہ وہ بارڈر کراس کر گیا ہے۔ کبھی کہتے، کہ بائیں بازو کے اخبار سے وابستہ تھا، کہیں چھپ گیا ہوگا۔

اور سارا وقت، اُن سب کو پتہ تھا، کہ چارلی نہیں ہے۔ اُس کو، تو اُنہوں نے خود، امریکیوں نے، امریکن ایمبیسی کے ایمبیسڈر کے دستخط سے گولی مار دی تھی۔ کیونکہ انجانے میں فرینچ فوجی افسر سے اُس کو وہ بھید معلوم ہو گئے تھے، جو معلوم نہیں ہونے چاہئیں تھے۔

اور آخر میں جب اُن کو اصلیت کا علم ہو جاتا ہے، امریکن ایمبیسی سے نہیں، کسی اور آدمی سے، کہ چارلی کو مارے ہوئے تو ایک ماہ ہو گیا ہے، تو باپ پاگل غصے میں چیختا ہوا امریکن ایمبیسڈر کو کہتا ہے، مَیں تم سب پر مقدمہ کروں گا۔ تم نے میرا بیٹا مار دیا ہے۔ اور امریکن ایمبیسڈر کہتا ہے، چلی میں تین سو امریکن کمپنیاں ہیں۔ کیمونسٹ سرکار اُن کو ختم کرنے پر تلی ہوئی تھی۔ مجھے مُلک کا اِنٹریسٹ، بچانے کے لیئے سرکار نے یہاں رکھا ہوا ہے۔ مَیں نے ان کمپنیوں کو بچانا تھا۔ یہ فوجی کُو، اس کے لیئے ضروری تھا۔ اس کے علاوہ وہ سرکار کس طرح بدلتی؟

کیونکہ دُنیا کو یہ بتانا ضروری ہے، کہ ہمارا کُو، میں کوئی ہاتھ نہیں ہے، اور اس کو اس کے اُلٹ باتوں کا پتہ چل گیا تھا، اس لیئے دیف، نہیں تھے۔

خیر، چارلی کی باڈی ڈھونڈ کر مجھے امریکہ بھیج دو۔ تم کو تو پتہ ہی ہے، کہ وہ ...... کہاں ہے۔

بالکل! باڈی آپ کو دو چار دِن میں مِل جائے گی۔

اور جس وقت وہ دُکھ سے ٹُوٹا باپ، جس کی کمر جُھک گئی تھی، اپنی بہو کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر، اور اپنے بیٹے کے اُجڑے گھر میں سے اس کی کتابوں اور ریکارڈوں اور چڑیوں کی رنگین تصویریں لے کر واپس آنے لگتا ہے، تو امریکن ایمبیسی کا ایک افسر کہتا ہے، باڈی بھیجنے کے لیے ساڑھے نوسو ڈالر خرچ آئیں گے۔ اس کا چیک دے دیں۔

اور باڈی پہنچتی ہے، ساڑھے سات ماہ کے بعد۔

ایک بکس جس پر "چارلی" لکھا ہوتا ہے۔

اور مقدمہ کئی ماہ چلا۔

مگر آخر میں خارج کر دیا گیا۔

اور مقدمے کی کاروائی خفیہ رکھی گئی، کیونکہ "اِن دی نیشنل انٹریسٹ" اس کو خفیہ رکھنا ضروری تھا۔

رات کو فلپ نے پروجیکٹر پر سلائیڈیں دکھائیں۔ گلیکسیوں کی سلائیڈیں۔ ستاروں کی۔

فلپ سڈنی سے باہر بنی بہت بڑی ٹیلیسکوپ کے ذریعے ستاروں کا ڈسٹلیشن کرتا ہے، اور اُن کی فوٹوگرافی۔ آسٹریلیا میں صرف یہی جگہ ہے، جو تقریباً ساڑھے چار ہزار فٹ اُونچی ہے۔ لاکھوں سال پہلے وہاں شاید جوالامکھی کی طرح زمین میں سے کچھ اُبلا ہوگا، جس سے چھوٹی پہاڑیوں کا ایک سلسلہ اُبھر آیا، ماتھے کے اُبھار کی طرح۔ اُن پہاڑیوں کے اُوپر ایک بہت بڑا گنبد ہے۔ اتنا اُونچا، جتنی سات آٹھ منزلہ

عمارت، اور وہاں یہ آبزرویٹری ہے۔ جس میں وسیع ٹیلیسکوپ ہے، اور اُس ٹیلیسکوپ کے گول خول میں بیٹھ کر ستاروں کی چال کے ساتھ ساتھ اس کے لینز کو گھمایا جاتا ہے، پوری رات۔ اور فوٹو کھینچے جاتے ہیں، اس عجیب وغریب دُنیا کے جو ہمارے طرف پھیلی ہوئی ہے۔

فلپ کہتا ہے، کہ سب سے نزدیک جو ہماری اپنی گلیکسی ہے، ہماری دُنیا کی اپنی۔ وہ دھرتی سے تین کروڑ روشنی کے برس، دُور ہے۔ یعنی اس کی روشنی کو ہم تک پہنچنے کے لیئے تین کروڑ برس لگتے ہیں۔ اور اس گلیکسی میں اربوں کھربوں ستارے ہیں۔ لاکھوں ستارے ہر وقت نئے پیدا ہو رہے ہوتے ہیں۔ یہاں سے جو صرف سُرخ دھبے دکھائی دیتے ہیں، وہ اصل میں جلتی ہوئی گیس کے بے شمار امبر ہیں، اور وہ جلتی ہوئی گیس ستاروں کو جنم دیتی ہے۔

ہر پل لاکھوں ستارے نئے بنتے ہیں، لاکھوں فنا ہوتے رہتے ہیں۔

اور اس گلیکسی سے پرے اور پرے، لاکھوں کروڑوں گلیکسیاں ہیں، جن تک ابھی تک کوئی ٹیلیسکوپ نہیں پہنچ سکی۔

اگر اُس کسی ستارے میں سے ٹیلیسکوپ سے کوئی ہماری دُنیا کو دیکھے، تو یہ بھی ستارے کی طرح چمکتی نظر آئے گی؟ میں فلپ سے پوچھتی ہوں۔

نہیں۔ یہ دھرتی تو نظر ہی نہیں آئے گی۔ وہاں سے صرف سورج نظر آئے گا۔

یا خدایا، یہ دھرتی باقی کائنات سے نظر ہی نہیں آتی۔ اور ہم، اس دھرتی کے لوگ اپنی اپنی چھوٹی چھوٹی ایگو، میں چھپے بیٹھے، عظیم بنے بیٹھے، ہم کیا ہیں پھر؟

گزشتہ سال ٹورنٹو کے دسرکوراماہال، میں فلم دیکھی تھی دلائیف آف مین، فلم شروع ہوئی، تو لگا، وسیع وعریض کائنات، جو ایک دھرتی کی کائنات ہے، آس پاس پھیلی ہوئی ہے، اور ہم درمیان میں لاچار سے چھوٹی سی چیونٹی کی طرح درمیان میں

کہیں بیٹھے ہیں۔ آس پاس سمندر گرج رہے تھے۔ گھنے وسیع جنگل سرسرا رہے تھے۔
ہوائیں گونج رہی تھیں۔ جنگلوں میں جانوروں کی طرح۔
مینہ، جھکڑ، ہوائیں، آندھیاں، طوفان۔ گرجتے ہوئے، گڑگڑاتے ہوئے۔
جل کے تھل۔ تھل کے جل۔ ریتوں کے بے پناہ۔
ریگستان۔ اُڑتی ریت میں سے زخمی سورج کے جسم میں سے رستا لہو۔ چاند، ستارے۔ اور دمدار، اور بڑے، ستاروں کے لاکھوں، کروڑوں جھنڈ۔ دھرتی گھومتی ہوئی۔ سورج گھومتا ہوا۔ پنچھی، لاکھوں کروڑوں پرندے اپنی اپنی دُنیا بسا کر بیٹھتے، اُڑتے، بچے پیدا کرتے، چیختے، مرتے، پیدا ہوتے، مرتے۔ سمندروں کی انتہائی گہرائی میں.....
عجیب وغریب دُنیا۔ حشرات الارض، پودے، سوراخوں والے پھر۔ عجیب شکلیں۔
یا خدایا! میں کانپنے لگی۔ اس ساری وسیع وعریض کائنات میں سے میں تم کو کہاں ڈھونڈوں گی؟ کہاں ڈھونڈوں گی؟ میں اپنی گمشدہ بیٹی کو پکارنے لگی۔ اور رونے لگی۔
میرے آس پاس مینہ برستے رہے، جھکڑ جھولتے رہے، طوفان گڑگڑاتے رہے، جنگل چیختے رہے، ہوائیں پگھلتی رہیں، اور سب کچھ میں گھری میں ایک چھوٹی سی چیونٹی، روتی رہی، روتی رہی۔

یہاں پت جھڑ کا موسم شروع ہو گیا ہے۔
ہائیڈ پارک اور ریجنٹ پارک میں اور سینٹ جیمز پارک میں، سڑکوں پر، پیومینٹس پر بے شمار آوارہ پتے اُڑتے رہتے ہیں۔ بے سہارا، معصوم، بے گھر۔
صبح صبح کسی پارک میں جائیں، تو درختوں کے نیچے، تنوں کے قریب براؤن اور بھورے اور سنہری پتوں کے ڈھیر پڑے ہوتے ہیں، جیسے تھک کر بیٹھیں چھوٹی گلہریوں کے جھنڈ!

رات جو ہَوا چلی ہو گی، ان پتّوں کو اپنے بہاؤ میں بھگاتی۔ اس کا احساس یہ ڈھیر دیکھ کر ہوتا ہے۔ رات کے اندھیرے میں پھنکارتی ہَوا کا، اور ہَوا سے ڈر کر سہمے ہوئے پتّوں کا۔

مینہ برس جائے، تو یہ ڈھیر مری ہوئی تتلیوں کے ڈھیر کی طرح بھیگتے رہتے ہیں۔

خاموش!

اور مینہ برسنے کے بعد جس وقت دھوپ نکلتی ہے، تو ان بھیگے ہوئے ڈھیروں میں سے عجیب سانس سے نکلتے ہیں، ہوا نک بھی نہیں، سینک بھی نہیں۔ نہ بدبو، نہ خوشبو۔ صرف سانس سے، بہت ہی عجیب، بہت ہی رازدار۔ جن میں سے گزرے زمانوں کی، اور گزری تیز دھوپ کی، اور گزری جنگلی ہواؤں کی بُو آتی ہے۔

گزشتہ چار پانچ دن اتنی زور کی گرمی تھی، کہ اس کا نام ولایتی لوگوں نے انڈین سمر رکھ دیا۔ اخباروں میں انڈین سمر کی خبریں۔ کارٹون، جن میں لوگوں کے سانس پھولے ہوئے بینچوں پر بیٹھے ہیں، اور دھوپ کے ظلم برداشت کر رہے ہیں۔

پچھلی راتیں بھی اتنی گرم تھیں، کہ رات کو بمشکل پتلی چادر لے کر اور کھڑکیاں کھول کر سویا جاتا تھا۔ لگتا تھا، دہلی میں سو رہے ہیں۔

لیکن آج آسمان میں بادل جلدی جلدی بھاگے جا رہے ہیں۔

موسم اُداسی والا ہے۔

ہَوا مناسب، بُوندا باندی۔

اصل میں یہی ہے لندن کا موسم۔

چھتریوں کا محتاج!

یہ بلڈنگ جس میں میں اور آر پنا رہ رہے ہیں، اور جس میں واکتوبر گیلری، ہے، اس کا نام ہے ونڈر دنیا ہاؤس ۔ مینجر تقریباً چالیس سالہ ایک عورت ہے، وچلی ہارڈز، جو شکل سے پچیس برس کی معلوم ہوتی ہے۔ چست، لمبی، پتلی۔ سفید گلابی چہرے پر بے حد کھلی اور انٹیلیجنٹ آنکھیں! خوبصورت!

سارا دن دھم دھم کرتی دونوں منزلیں چڑھتی رہتی ہے، اترتی رہتی ہے۔ ٹیلیفون سنتی، آنے والوں کے ساتھ باتیں کرتی، فائلیں سنبھالتی، چٹھیاں لکھتی، ٹائپ کرتی، ٹیلیکس آپریٹ کرتی، اور ہفتے میں ایک دن باری پر کھانا پکاتی۔

اپنے بارے کل بتا رہی تھی، میں کولوراڈو میں پیدا ہوئی تھی، امریکہ کے بالکل جنوب میں۔ پہلے میرا باپ ایک فیکٹری چلاتا تھا۔ پھر اس کو بند کر کے فارم لے لیا۔ اور پھر بلڈنگوں کی خرید و فروخت کا کام کرنے لگا، کہ دنیا کا سب سے اچھا، اور سب سے زیادہ پیسے کمانے والا دھندہ بس پراپرٹی کا ہے، اور سب سے سیانے لوگ یہی کام کرتے ہیں۔ جو اور کام کرتے ہیں، وہ سارے مورکھ ہیں۔ مورکھ ہیں، اسی لیئے اور کام کرتے ہیں۔

مجھے پینٹنگ کا شوق تھا، کتابیں پڑھنے کا شوق تھا۔ لیکن میرے باپ کو رنگوں سے بھی نفرت تھی، اور کتابوں سے بھی۔ اس لیئے ڈرتی ہوئی میں نے نہ کبھی رنگوں رنگوں والا چاک ہاتھوں میں پکڑا، نہ کوئی کتاب، سوائے سکول کی کتابوں کے۔

ہمارے گھر میں صرف ایک پینٹنگ تھی، جو میرے باپ نے کسی آرٹسٹ سے کمیشن کر کے بنوائی تھی، اور اس میں ہمارے گھر سے دکھائی دینے والا لینڈ سکیپ تھا، اور دور پہاڑ۔

ہمارے شہر کلوراڈو میں صرف ایک ہی آرٹسٹ رہتی تھی، اور اس کے ساتھ ہمارا ملنا، بولنا منع تھا۔

ویسے شہر کے زیادہ لوگ اُس سے بچ کر رہتے تھے۔ وہ اکیلی رہتی تھی، اور اپنے طریقے سے رہتی تھی، اسی لیئے سب اُس کو بھوتنی یا چڑیل سمجھتے تھے۔
مجھے پتہ تھا، کہ اگر میں نے بچنا ہے، تو مجھے یہاں سے بھاگ جانا چاہیئے۔ اور بھاگنے کا ایک ہی طریقہ تھا، کہ میں کوئی بدیشی زبان پڑھوں۔ اس لیئے فرنچ پڑھنی شروع کی، دن رات۔ اور آخر فرانس چلی گئی۔ اس وقت میری عمر اٹھارہ برس کی تھی۔
فرانس کی دُنیا ہی مختلف تھی۔ کام بھی کرتی تھی، پڑھتی بھی تھی۔ پھر بھی بالکل تھکی نہیں تھی۔ فرانس میرے لیئے جنت تھا۔ پورا ہفتہ اور اتوار کا دن میں آرٹ گیلریوں میں گھومتی رہتی تھی۔ وان مارا میری پسند تھا، اور میرا محبوب۔ جہاں کہیں بھی اُس کی پینٹنگ ہوتی، میں جاتی، اور گھنٹوں کے گھنٹے، دنوں کے دن وہاں بیٹھی اس کو دیکھتی رہتی۔ مڑ مڑ کر وہاں ہی آجاتی۔
اور شام کو کبھی سینما جاتی، اور کبھی تھیٹر۔
میں ایک بھوک کی، جنموں کی بھوک کی، بھٹکی آتما تھی، اور پینٹنگز دیکھ کر، تھیٹر دیکھ کر، سینما دیکھ کر میری بھوک اور بڑھتی۔
آدھی رات تک میں کتابیں پڑھتی رہتی۔ اُن دنوں کامو اور سارتر مجھے خدا معلوم ہوتے تھے۔
گھر والوں کو کہا، میں نے اس کے ساتھ شادی کرنی ہے۔ میرے ماں باپ تو خودکشی کرنے پر تل گئے۔ آپ اپنے محبوب کو اپنے ساتھ لے کر اُن سے ملوانے گئی۔ مگر میرا باپ کہے، کہ آرکیٹکچر بھی کوئی کام ہے۔ مکان کا بنانا کیا ہے، بُنیاد کھودو، دیواریں تعمیر کرو، چھت ڈالو، مکان تیار۔ اس میں آرٹ کہاں سے آگیا؟ اصل کام تو بنے ہوئے مکان کو فروخت کرنے کا ہے۔
اس لیئے ہم یہاں آگئے، اور شادی کر لی۔

میرا خاوند فلپ، جس کو میں ٹی ۔ سی، کہتی ہوں، یعنی تھنڈر کلاؤڈ، وہ اس انسٹیٹیوٹ آف ایکوٹیکنکس میں کام کرتا تھا، اس لئے میں بھی اُس کے ساتھ کام کرنے لگی۔

یہ انسٹیٹیوٹ کچھ سائنسدانوں نے اور آرٹسٹوں اور انجینئروں مل کر بنایا ہے ۔ مقصد ہے، اس دُنیا کو بہتر بنانا، اس میں زیادہ خوبصورتی بھرنا ۔ آج انسان کیا کر رہا ہے؟ قدرت کی دی ہوئی خوبصورتی کو تباہ کر رہا ہے ۔ ندیوں کا پانی گدلا کر رہا ہے، سمندروں میں نیوکلیئر ویسٹ پھینک کر پانیوں کو زہریلا کر رہا ہے ۔ لاکھوں مچھلیاں یا تو زہریلے پانی سے، مر رہی ہیں، اور یا انسان کے پیٹ میں پہنچ رہی ہیں، دھرتی کی پیداواری طاقت ہر روز برباد ہوتی جا رہی ہے ۔ ہواؤں میں فیکٹریوں کا دھواں ملتا جا رہا ہے ۔ انسان ریشم کے کیڑے کی طرح اپنے ارد گرد اپنی ہی قبر بنا رہا ہے، اس کا بندوبست ہونا چاہیئے۔

میں جانتی ہوں، ہم پندرہ بیس افراد یہ نہیں کر سکتے ۔ لیکن ہم شروعات تو کر سکتے ہیں، ایک نئے سپنے کی، ایک نئے زندہ رہنے کے سلیقے کی ۔

اور ہم پرانے زمانوں کی طرح، درختوں کے تنوں سے بنی بیڑیوں پر بغیر ملاحوں کے جنگلی دریا کا سفر کرتے ہیں ۔

انگیزین جیسے سمندروں کو ہم پار کرتے ہیں ۔ ہم ٹیلیسکوپ کے ذریعے ستاروں کی دُنیا کو کھنگالتے ہیں ۔ ہم فارموں پر کام کرتے ہیں ۔ ہمارے سینٹر امریکہ میں ہیں، میکسیکو میں، فرانس کے دکھن میں، آسٹریلیا میں اور ایک چھوٹا سینٹر نیپال میں ۔ ویسے ہم نے گجرات کے دیہاتوں میں بھی جا کر کام کیا ہوا ہے ۔

آسٹریلیا میں جو سینٹر ہے، اس کے ساتھ ایک بڑا سارا فارم ہے ۔ اس میں میرے دونوں بیٹے رہتے ہیں، اور کام کرتے ہیں ۔

بیٹے؟ تمہارے بیٹے بڑے ہیں؟ تندرست ہیں؟ فارم پر کام کرنے کے قابل؟

ہاں، دو۔ ایک بارہ سال کا، ایک پندرہ سال کا۔ اور ایک دس سال کی لڑکی ہے، وُہ فرانس والے فارم پر رہتی ہے۔

لیکن تم اپنے چھوٹے بچّے..... اس طرح دُور..... میں حیران ہوں، اس کے زندہ رہنے کے سلیقے پر۔ اُس کی زندگی کے انداز پر۔

ہاں، میرا خاوند اور میں، ہم دونوں یہ سوچتے ہیں، کہ بچوں کو قدرت کے قریب رہنا چاہیئے۔ کھیتی میں کام کرنا، اور اس میں سے اناج پیدا کرنا۔ اس سے زیادہ کوئی بھی اچھی ایجوکیشن آپ بچوں کو نہیں دے سکتے۔ اور میری بیٹی ایلشا جب وُہ چار برس کی تھی، اُس وقت ہی وُہ گائے دہو لیتی تھی۔ اب فارم پر وُہ چار گایوں کی دیکھ بال کرتی ہے۔

اور وُہ اپنے تینوں بچوں کی تصویریں دکھاتی ہے۔

قریب فلیش ایلن بیٹھی ہے۔ آرٹسٹ۔ وُہ کبھی کسی سینٹر میں اپنا سٹوڈیو لے جاتی ہے، کبھی کسی میں۔ آج کل میکسیکو میں ہے۔ لندن ڈرامے دیکھنے آئی ہوئی ہے۔ کہتی ہے، گھوڑے بھی عجیب چیز ہیں۔ فیسینٹنگ۔ موسٹ فیسینٹنگ کریچرز۔ میں آج کل میکسیکو میں گھوڑے سنبھالنے کا کام سیکھ رہی ہوں۔ پہلی بار مجھے احساس ہوا ہے، کہ گھوڑے سوار آدمی اپنا کچھ بھی نہیں چھپا سکتا۔ اس کی ساری شخصیت بے نقاب ہو کر ننگی ہو کر سامنے آجاتی ہے۔

بڑی عجیب بات ہے۔ نہیں؟ کوئی آدمی گھوڑے پر چڑھ کر لونا ہو جاتا ہے، کوئی بانکا۔ کوئی پھیل جاتا ہے۔ کوئی پرندے کی طرح دونوں بازو پھیلا لیتا ہے، کھلے پروں کی طرح۔ کوئی ڈرا ہوا بیٹھتا ہے۔ کسی کو گھوڑے پر بیٹھ کر شہنشاہی مل گئی محسوس ہوتی ہے۔ بہت مسٹیریس بات ہے۔ میں حیران ہوں!

لنڈو نیا ہاؤس کے کیفے میں میز کے گرد آج ہم پانچ عورتیں بیٹھی تھیں۔
اس لنڈو نیا ہاؤس میں ہمارے کسی سینٹر سے کوئی بھی مرد اگر کام کرنے آجائے، تو چار دن نہیں ٹکتا۔ چپر ڈکر، تھک کر چلا جاتا ہے۔

—— کیونکہ تیری اپنی پرسنیلٹی میں اتنی طاقت ہے، اس میں اتنا جمگھٹ ہے، کہ ہر مرد تیرے سامنے اپنے آپ کو بونا محسوس کرتا ہو گا۔ فنا ہو جاتا ہو گا۔ اور گھبرا کر دوڑ جاتا ہو گا، تمہارے ساتھ لڑنے جھگڑنے کا بہانہ کر کے، میں کہتی ہوں۔

فرینک کہتی ہے، نہیں، میں بتاؤں؟ یہ کمبخت خوبصورت بڑی ہے۔ ہر مرد کا اس پر دل آجاتا ہے، اور یہ پاؤں پر پانی نہیں پڑنے دیتی۔ کیونکہ یہاں کی مینیجر ہے، اس لئے سوچتی ہے، کہ اس کو بس مینجری ہی کرنی چاہیئے۔

کل رات پارٹی پر وہ ہوسٹن تمہاری طرف بڑی بھوکی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ ایلینا فرینکی کو کہتی ہے۔

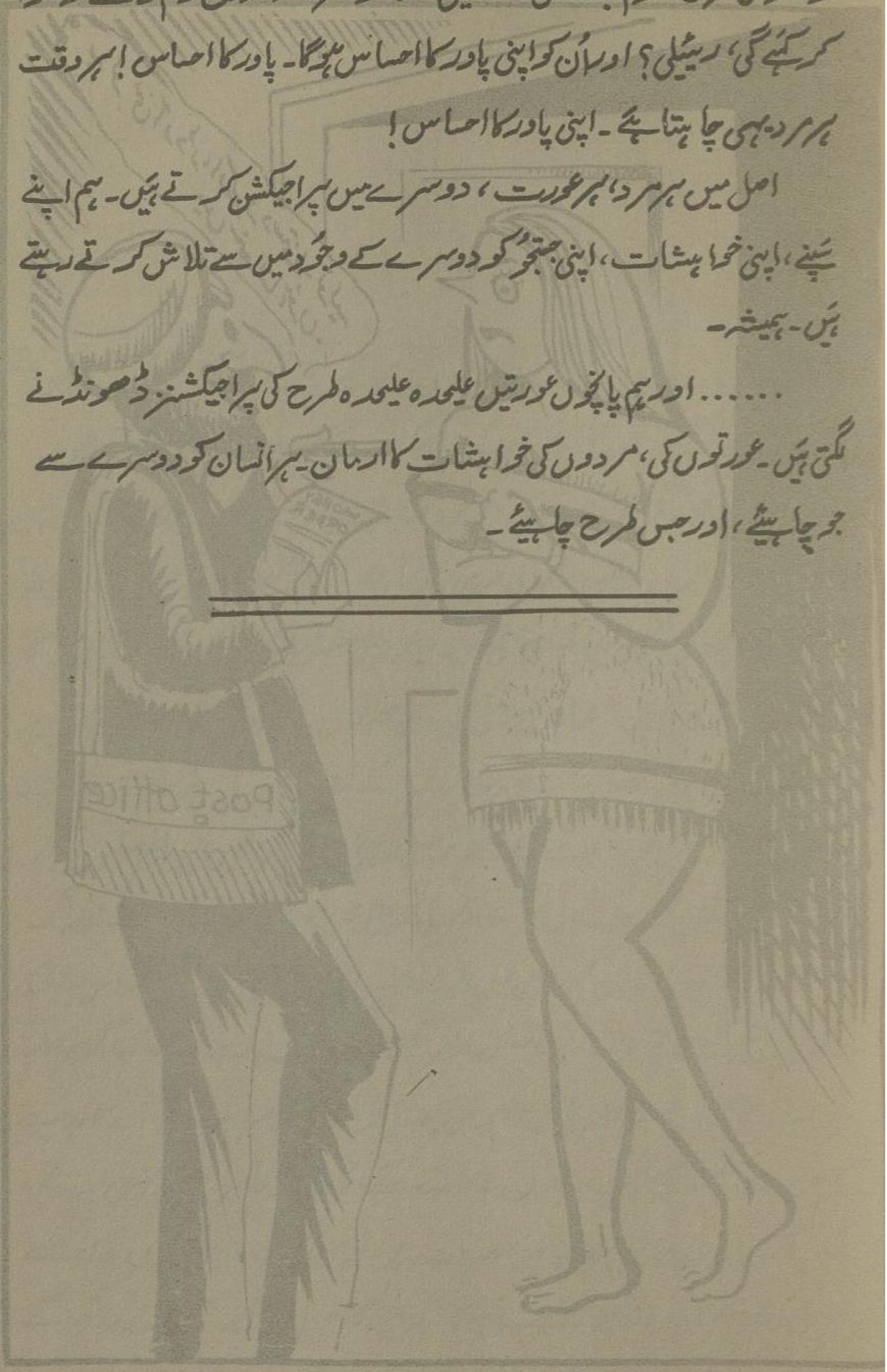
ہاں، مجھے کہنے لگا، یو آر ویری بیوٹی فل۔ اور میں نے گردن اکڑا کر، یوں، (اور وہ بھویں اونچی اٹھا کر کسی مہارانی کی طرح پاؤں پر گرے، جیسے کسی بھکاری کو دیکھتی ہو) میں نے کہا، یس، آئی نو۔

میز پر ایک قہقہہ تتلی کی طرح اڑتا ہے۔

میں بھی اسی طرح کرتی ہوں۔ اگر کوئی اس طرح کی بات کرے، تو میں بھی اس کو اسی طرح قتل کرتی ہوں۔ ایلنیا ہنستی ہے۔

رچلی ذرا سا سوچتی ہے، پھر کہتی ہے، ہاں، اگر میں نے اس کو ٹالنا ہو، تو یہی کہوں گی۔ لیکن، اگر میرا بھی اس پر دل آجائے، تو ......

خیر، پھر تو بات ہی دوسری ہے۔ لیکن یہ مرد ویسے یوں ہی سوچتے ہیں۔ بس، جس عورت کی طرف بھی وہ دیکھ کر یہ کہہ دیں گے، یو آر بیوٹی فل ہنی، اور



وہ لٹو کی طرح گھوم جائے گی۔ آنکھیں مٹکا کر، شرما کر، گردن کو خم دے کر، لرز کر کہے گی، رسیلی؟ اور اُس کو اپنی پاور کا احساس ہوگا۔ پاور کا احساس! ہر وقت ہر مرد بھی چاہتا ہے۔ اپنی پاور کا احساس!

اصل میں ہر مرد، ہر عورت، دوسرے میں پراجیکشن کرتے ہیں۔ ہم اپنے سپنے، اپنی خواہشات، اپنی جستجو کو دوسرے کے وجود میں سے تلاش کرتے رہتے ہیں۔ ہمیشہ۔

...... اور یہ پانچوں عورتیں علیحدہ علیحدہ طرح کی پراجیکشنز ڈھونڈنے لگتی ہیں۔ عورتوں کی، مردوں کی خواہشات کا ارمان۔ ہر انسان کو دوسرے سے جو چاہیئے، اور جس طرح چاہیئے۔


یہ لو منی آرڈر ادھر کرو دستخط۔ تولیہ میں سنبھالتا ہوں۔
MONEY ORDER
Post office

باتوں سے دلوں کے، احساسوں کے، تجربات کے کنوئیں کھودتے کھودتے گھٹنے ٹیک گئے۔ اور آخر کار ہم نے پراجیکشنوں کی اس طرح کی کیٹیگریاں بنالیں۔

ایک عورتیں وہ ہوتی ہیں، جو خودمختار ہوتی ہیں۔ چاہے تھوڑی بہت ہی خوبصورت ہوں، لیکن انتہا کی ذہین ہوتی ہیں۔ انٹیلیجنٹ۔ یہ عورتیں ملک چلاتی ہیں، کاروبار چلاتی ہیں، بزنس چلاتی ہیں۔ یہ عورتیں منسٹریاں کرتی ہیں، کارخانوں کی منیجر اور ڈائریکٹر ہوتی ہیں، اخباریں چلاتی ہیں۔ ان عورتوں سے مرد ذرا دور ہی رہتے ہیں۔ ان کے جاہ و جلال سے ڈرتا ہے۔ اِن عورتوں کے رُوبرو اس کی ایگو زخمی ہوتی ہے۔ اس لیئے یہ عورتیں عموماً محبت کے لیئے ترستی رہتی ہیں، لیکن آہیں نہیں بھر سکیں، پیار مانگ نہیں سکیں، صرف اس کا انتظار کرتی رہتی ہیں۔ عام طور پر وہ نہیں آتا۔ اور اگر کبھی تھوڑی بہت شادی کروا بھی لیں، تو وہ شادیاں فیل ہو جاتی ہیں۔ اور اس شادی سے پیدا ہوئے بچے ہمیشہ ماں کو قصوروار سمجھتے ہیں۔ عجیب بات ہے، کہ اگر مرد کلیتاً ہو اپنے کام کاج میں، اور اس کام میں پھنسا ہوا، بے حد مصروف ہو، اور مصروفیت کی وجہ سے بچوں کی طرف دھیان نہ دے سکے، تو بچے عموماً اس کا گلہ نہیں کرتے۔ لیکن اگر ماں اپنے کام کاج میں مصروف ہو، تو اس کو ہر وقت بچوں کے سامنے معافی کی خواستگار رہنا پڑتا ہے۔ اُن کا دگنا چوگنا خیال نہ رکھنے کے باوجود اُن کے

سامنے گنہگار بننا پڑتا ہے۔

اس لیئے یہ سمجھ لیا جائے، کہ عورت کی ذہانت اور اس کی کامیابی اُس کی بددُعا ہے۔

دُوسری قسم اُن عورتوں کی ہے، جو خواہ مخواہ اپنے آپ کو مرد کے سامنے کمزور پیش کرتی ہیں۔ میں وہاں اکیلی کس طرح جاؤں؟ میں یہ کیل کیسے ٹھونکوں؟ ہائے بلب فیوز ہو گیا ہے، اب میں کیا کروں؟ اُف، بجلی کڑکتی ہے، تو مجھے خوف آتا ہے جی! ہائے، مجھے تو اندھیرے سے بہت خوف آتا ہے۔ ان عورتوں پر ہر مرد مرمِٹتا ہے، بالکل فدا۔ اُن کو پروٹیکٹ کرنے کے لیئے دیوانہ۔ یہ عورتیں ساری عمر مرد کو نکیل ڈال کر رکھ سکتی ہیں۔ ان کی کمزوری ہی ان کا سب سے بڑا ہتھیار ہے، مرد کو قابو کرنے کے لیئے، اور قابو رکھنے کے لیئے۔

تیسری قسم کی عورتیں بس مرد کو تھوڑا تھوڑا کر کے کھا لیتی ہیں۔ اس کی ذہانت کو، اُس کی کلا کو، اُس کے اندر کے انسان کو، اُس کے سپنوں کو، آہستہ آہستہ نچوڑ لیتی ہیں۔ اور اُس کو پتہ بھی نہیں لگتا۔ اور جب پتہ لگتا ہے، تو بہت دیر ہو چکی ہوتی ہے۔

اور چوتھی قسم کی عورتیں بس سبزیاں ہیں، گوبھی اور آلو۔ بالکل ویجیٹیشن۔ زندہ رہنا، محض ویجیٹیٹ کرنے کا عمل۔ باہر کا کام، گھر کا کام، جھاڑو لگانا، باورچی خانہ کا کام کرنا، برتن مانجھنا، ٹیلیویژن، پڑوسیوں کے ساتھ بُرائی چغلی، بچے پیدا کرنے اور پالنے۔ کبھی جھگڑا، کبھی صُلح۔ اور سیکس۔ بس۔ ساری عمر۔ ساری عمر وہی چکی، اور وہی چکی کے پاٹ۔ نہ کوئی سپنا پالنا، نہ اس کی تکمیل کے لیئے کوشش کرنا، اور نہ ادھورے سپنے کا جوغہ اُتارنا۔

اور یہ سب کیٹیگریاں، اُلٹی طرف سے مردوں پر لاگو ہوتی ہیں۔

بیروت میں قتلِ عام۔

کچھ ہی عرصہ پہلے بھی یہاں بہت خون خرابا ہوا تھا۔ پریزیڈنٹ بشیر جائل بھی قتل کر دیا گیا تھا۔ لیکن اُس کے بعد کے قتلِ عام کو پڑھ کر تو ۱۹۴۷ء کے پنجاب سے ریفیوجیوں کے قافلے یاد آ گئے۔ جن کو رات کو پڑاؤ ڈال کر بیٹھے عورتوں، بچوں اور بوڑھوں سمیت قتل کر دیا جاتا تھا۔ گاڑیاں چلتی تھیں، تو اُن میں سہمے ہوئے بے گھر لوگ ہوتے تھے۔ ڈرے ہوئے، سمٹ کر اور چھپ کر بیٹھے ہوئے۔ گاڑیاں اپنے ٹھکانوں پر پہنچتی تھیں، تو ان میں لاشیں ہوتی تھیں، اور خون، جو ابھی بھی گرم ہوتا تھا۔

اور پھر ویت نام، افریکہ، کوریا، بنگلہ دیش، آئرلینڈ!

اور اب ..... بیروت!

فلسطینیوں کے شرنارتھی کیمپ۔ چاتیلا اور سابرا۔ چھوٹے چھوٹے جھونپڑے نما گھروں میں لوگ۔ سالہا سال اُن کو اصلی گھروں کی آس میں یہاں رہتے ہو گئے ہیں۔ کوئی ایک کمرے کا گھر، کوئی دو کمروں کا۔ اسرائیلی فوجی ٹینکوں کے ساتھ اگر کیمپوں کے گیٹ بند کر لیں، اور اندر داخل کر دیں خریدے ہوئے خونخوار خون کے پیاسے راکشس، اور بھون دیں اندر سب کو، چیونٹیوں کی طرح!

قہر!

دن دیہاڑے، سورج میں سے برستی راکھ اور تارکول!

اور سب کچھ بڑی پکّی پلاننگ کے ساتھ کیا گیا۔ اسرائیلی فوجی ہیلی کاپٹروں اور ٹینکوں میں قاتل بھر کر لاتے گئے۔ پوری سڑک کے نشانات کو (روڈ سائین) کو روغن کر کے چمکایا گیا، اور تیر کے نشان دے دے کر لکھا گیا، ایم۔ پی، یعنی میٹنگ پوائنٹ، ادھر کو۔ اور تیر کے نشان سارے ہی کیمپوں کی طرف انگلی کر رہے تھے۔

ابھی امریکہ، فرانسیسی اور اطالوی فوجوں کو واپس گئے دس ہی دن گزرے تھے۔ اپنی طرف سے وہ صُلح صفائی کروا کر، شہر میں امن امان کروا کر گئے تھے۔ لیکن یہ جانا آنا سب دُنیا کی معصوم اور بھولی رُخساروں پر سے آنسو پونچھنے والی بات ہوتی ہے۔ سارے کام تو رِیموٹ کنٹرول، سے ہوتے ہیں۔

اسرائیلی ٹینک اور فوجیں کیمپوں کو گھیر کر کھڑی ہو گئیں، اور تقریباً اٹھارہ سو خونخوار قاتل کیمپوں کے اندر داخل ہو گئے۔

اور لاشیں ملی ہیں، عورتوں کی، جو چولہے کے پاس بیٹھی روٹیاں پکا رہی تھیں، بچوں کی، جو گلیوں میں کھیل رہے تھے، بوڑھوں کی جو دھوپ سینک رہے تھے۔

ایک ماں اور ایک باپ اپنے تینوں بچوں کو مرغی کے پَروں کی طرح چھپا کر بیٹھے تھے، اُن پر بچھے ہوئے۔ جسم گولیوں سے چھلنی، کیونکہ گولیاں اُن کے جسموں میں سے گزر کر اُن تینوں بچوں تک پہنچی تھیں، جو اُن کے جسموں کے نیچے چوزوں کی طرح چھپے ہوئے تھے۔

دیواروں کے قریب جوان مردوں کے ڈھیر، اور دیواروں پر گولیوں کے نشان اور گڑھے، اور خون اور ہڈیوں کے چھوٹے باریک ٹکڑے۔

گھروں میں داخل ہوں، تو اگلا کمرہ بالکل خالی، صرف پردے ہوا میں پھڑپھڑاتے ہوئے، ڈراؤنی آواز پیدا کرتے، اور اندرونی کمروں میں اپنی طرف سے حفاظت والی جگہ میں چھپے، پورے کے پورے کنبے گولیوں سے چھلنی کیے ہوئے۔

فرش پر بکھرا لہو!

قتل کے بعد کئی گھروں کو ڈائنامائیٹ کے ذریعے اُڑا دیا گیا۔ جو اندر چھپ کر سہم کر بیٹھے تھے، ریت کی طرح اُڑ گئے۔

اور اس کے بعد چلائے گئے، روڈ رولر بلڈوزر!

اور ملبے کے نیچے سے نکلا کوئی ہاتھ...... ہڈیوں کے ٹکڑے...... ٹانگیں بازو کچلے ہوئے...... اور بال، لہو کے ساتھ جمے ہوئے۔ صرف بال، سر نہیں۔

جیمز کیمران، فارن کارسپانڈنٹ، جس نے کئی لڑائیاں یعنی جنگوں کو بچشم خود دیکھا ہے، اور اُن کے بارے اخبارات میں لکھا ہے۔ دوسری جنگ عظیم کے آخری دنوں میں برلن کے بارے میں لکھتا ہے، برلن کے ایک آدھے گرے ہوٹل میں ہم سب فارن کارسپانڈنٹ ساری دنیا کے اخبارات کی طرف سے آئے ہوئے ٹھہرے ہوئے تھے۔ برلن میں اُن دنوں صرف ملبے کے ڈھیر نظر آتے تھے، یا بھوک سے نڈھال بھٹکتی ہوئی پراسٹیچیوٹس۔ ایک روز رات کو ہم کھانا کھانے لگے (جو اچھا بُرا اس شہر ویراں میں ملتا تھا)، کہ کھڑکی سے باہر ہم کو ادھیڑ عمر طوائف نظر آئی۔ بے حد بدصورت، بھوک سے نڈھال، میلی کچیلی پھٹے ہوئے کپڑے۔ وہ کھڑکی کے شیشوں کو کھٹکھٹا رہی تھی، اور اتنی حسرت اور اتنی لاچاری سے ہمارے کھانے کی طرف دیکھ رہی تھی، کہ ہمارے لئے لقمہ منہ میں ڈالنا ممکن ہی نہ رہا۔ ہم نے اس کو اندر بُلا لیا، میز کے گرد بٹھالیا۔ برسوں کے بھوکے بھیڑیئے کی طرح، وہ کھانے پر ٹوٹ پڑی۔ اور ساتھ ہی اس کو اپنے پیشے کا بھی لحاظ تھا۔ برابر آنکھیں مٹکاتی، نزاکت سے، کمر کو بل دیتی، مسکراتی...... پیٹ بھر کر روٹی کھا چکی، تو سوال یہ پیدا ہوا، کہ اُس کو اپنے کمرے میں کون لے جائے۔ اتنی میلی، بدصورت، پھٹے کپڑوں والی ادھیڑ عمر عورت۔ اگر ہم اس کو کہتے، کہ تم لبس جاؤ، ہم کو تمہاری ضرورت نہیں۔ روٹی کھالی ہے تم اب گھر جاؤ، تو اس نے اس کو اپنی توہین سمجھنا تھا، سخت بے عزتی۔ وہ ایک شریف ورکنگ تھی، کوئی بھکارن تو نہیں تھی، جس کو ہم کھانا کھلا کر سڑک پر دھکا دے سکتے تھے۔ روٹی کھلانا مشکل نہیں تھا، لیکن یہ اگلی بات بہت مشکل تھی، ہم ایک

دوسرے کی طرف مدد کے لیئے جھانک رہے تھے، تو وہ اپنے بال سنوار رہی تھی۔ ٹماٹروں کی چٹنی میں اُنگلی ڈبو کر لپ سٹک کی طرح اس نے اپنے ہونٹوں پر مَل لی، اور ہنسنے لگی۔ ......

....

ہم میں سب سے سیانا، سب سے بزرگ کار سپانڈنٹ فری مین اُٹھا۔ ہم سب کے لیئے تیار ہو کر قربانی کرنے کے لیئے، اور کہنے لگا، مے آئی ہو دی آنر؟ وہ ہنستی ہوئی اس کے ساتھ چل دی۔ لِفٹ کا بیرونی جنگلے والا دروازہ ٹوٹا ہوا تھا۔ اس ٹوٹے ہوئے دروازے والی لفٹ جب اُن دونوں کو لے کر اُوپر جانے لگی، تو وہ ہم کی طرف دیکھ کر ہنستے ہنستے کہنے لگی، دیکھو، میں نے فری مین کا انتخاب کیا ہے، تم سب میں سے فری مین کو۔

....

دوسرا قصہ اُس نے کوریا کی لڑائی کا لکھا ہے۔ ساؤتھ کوریا میں، ساؤتھ کورین جنرل نے کانسنٹریشن کیمپ بنائے ہوئے تھے۔ سب کا خیال تھا، کہ ان کیمپوں میں نارتھ کورین فوجی بھرے ہوئے ہیں۔ کسی نے ان کیمپوں کے بارے زیادہ پُوچھ پڑتال کی ضرورت نہیں سمجھی تھی، کیونکہ کیمپوں کے بالکل قریب ہی، صرف ایک منٹ کے فاصلے پر، یونائیٹڈ نیشن کمشن، کا دفتر تھا، اور یہ کمیشن کوریا کی لڑائی کی دیکھ بھال کے لیئے ہی وہاں بیٹھا تھا۔

لیکن ایک دن اچانک میں وہاں چلا گیا۔ چھوٹے چھوٹے لوگ، پیلے زرد چہرے، زنجیروں سے بندھے، پاؤں کے بَل بیٹھے ہوئے بھی چھوٹے دکھائی دے رہے تھے۔ آس پاس گندگی تھی، غلاظت کے ڈھیر تھے۔ ان چڑ ہے جیسے لوگوں کو دیکھ کر معلوم ہوتا تھا، کہ اُنہوں نے برسوں سے کچھ نہیں کھایا، اور یہ سب ساؤتھ کورین ہی تھے۔ ساؤتھ کوریا کے لوگ، جن کو ساؤتھ کورین ملٹری نے اس لیئے ان کیمپوں میں بند کر رکھا تھا، کیونکہ وہ

مشکوک تھے۔ نہ کوئی مقدمہ، نہ کوئی فریاد۔ اور سب سویلین۔ جن میں دوکاندار ہوں گے، سکولوں کے ماسٹر اور کالجوں کے پروفیسر ہوں گے، نوکری پیشہ بابو ہوں گے، سٹوڈنٹ اور شاعر ہوں گے، موسیقار اور مصنف ہوں گے۔

..... مجھے اتنا غصّہ آیا، کہ یونائیٹڈ نیشن کمشن کے دفتر چلا گیا۔ وہ کہنے لگے، کہ یہ اُن کا اندرونی معاملہ ہے، ہم دخل نہیں دیتے۔

اندرونی معاملہ؟ حرامیو، کبھی انسانی مسئلے بھی اندرونی معاملے ہوتے ہیں؟ میں اُن سے لڑا جھگڑا، مگر کچھ نہ بنا۔ اور پھر میں نے لفظ لفظ سچی رپورٹ تفصیل سے لکھ کر اپنے میگزین کو بھیج دی اور ساتھ فوٹو بھی۔ نتیجہ یہ ہوا، کہ کچھ ماہ کے اندر اندر میری نوکری بھی ختم ہو گئی، اور میگزین کا بھی فاتحہ پڑھا گیا۔ نہ بانس رہا، نہ بانسری۔

جنگ کی خبریں پڑھ پڑھ کر مجھے ملک کی تقسیم کے وقت کا پنجاب یاد آ رہا ہے، رہ رہ کر۔ جیسے تصویر کھینچنے کے ڈبے پیچھے لٹکا کالا پردہ۔

لبنان میں بہے تازہ لہو کا غبار سر کو چڑھتا ہے، اور محسوس ہوتا ہے، کہ میں گم ہو گئی ہوں۔ جیسے مجھ میں اور کچھ ہضم کرنے کی طاقت ہی نہیں رہی۔

انسان کے اندر یہ جو ایک مشین سی ہے نا، جس میں سے بیرونی احساسات چھن کر اندر جاتے ہیں، اندر رچ جاتے ہیں، جذب ہو جاتے ہیں، اور پھر الگ شکل میں نمودار ہوتے ہیں، وہ مشینری معصوم لہو کو سڑک کی مٹی میں کیچڑ بنا دیکھ کر جام ہو جاتی ہیں۔ نہیں؟

تابنی مٹو کے ساتھ آج ایک شاعر بہرمن آیا تھا۔ کہنے لگا، اس نے لبنان پر ایک نظم لکھی ہے۔ مجھے محسوس ہوا، کہ یہ اس کا پرائیویٹ سا مذاق تھا۔ بہتے ہوئے خون کو دیکھ کر نظم؟ یا خدایا۔

لیکن پھر روزمرہ کی زندگی کے کمزور سے تقاضوں میں بندہ چابی کے کھلونوں کی

طرح، ربورٹ کی طرح چلنے لگتا ہے۔ نہانے لگتا ہے، روٹی کھانے لگتا ہے، جرابیں دھونے لگتا ہے، برش کرنے لگتا ہے، چھٹیاں لکھنے لگتا ہے، کنگھی کرنے لگتا ہے۔ اور یہ روزمرہ کی زندگی کی بے مطلب سی ہلچل اس کو چلائے رکھتی ہے، اور جاری رہتا ہے، وہ۔ یہی شاید ہمارا قدیمی، پرانا، سروائیول میکنزم ہے، محض زندہ رہنے کا طریقہ۔ ورنہ بندہ ہمت ہار کر بیٹھ جائے، تو پھر کھڑا بھی نہ ہو سکے۔

یہاں سے ایک شاعری کا میگزین نکلتا ہے، ' پوئیٹری لندن '، ایڈیٹر ہے، تامبی متو۔ دفتر اس کا اسی بلڈنگ لنڈونیا ہاؤس میں ہی ہے۔

تامبی متو اپنے آپ میں ایک عجیب انسٹیٹیوٹ ہے۔ بکھرے بال، اور بغیر شیو کیے منہ پر گھسے ہوئے برش کی طرح کے بال۔ میلی سی لٹکی ہوئی بڑھی ہوئی گرے پتلون پر گرے ہی کورٹ، اس کے سر کے بالوں جیسا۔ میلا سا۔ کل ملا کر کافی پھیچر اور میلا کچیلا سا بندہ۔

لیکن تامبی متو شاعر ہے۔

اس کے بارے اس کی اپنی بیٹی لکھتی ہے، اس کے کمرے میں بیئر کے ڈبے، خالی ڈبے، اور شراب کی خالی بوتلوں کے ڈھیر لگے ہوتے ہیں۔ ہر بار حیرانی ہوتی ہے، کہ وہ خود کہاں بیٹھتا ہوگا۔

ہر وقت آواز بھی اور پاؤں بھی لڑکھڑاتے ہوئے۔ بس یہی کہے گا، آئی ایم ٹیرڈ، اور یہ بھی لگے گا، کہ بس یہاں سے نکل کر یا تو پرے سڑک پر گر گیا ہوگا، یا سٹیشن پر۔ من سے یہی دعا نکلے گی، یا خدا، بے چارہ اپنے بستر تک پہنچ جائے۔

لیکن اگر کوئی خوبصورت لڑکی دیکھ لے، جس کے لمبے بال ہوں، اور ساتھ وہ شاعرہ یا آرٹسٹ، تو وہ سات جوانوں سے بھی زیادہ عاشق ہو جاتا ہے۔ پھر

چاہے، بے شک اُس کو پوری رات بٹھا کر باتیں کر والو۔

چلی کہتی ہے، ہر خوبصورت لڑکی کو یہ کہا جاتا ہے، بس اُس ساری کی ساری کو وہ چوس لیتا ہے، فنا کر دیتا ہے۔

اس عمر میں بھی اگر بندے میں چوس کر فنا کرنے کی طاقت ہو سکتی ہے، تو کیا یہ بھی ایک معجزہ نہیں ہے؟

اس کے ساتھ گفتگو کرتے ہوئے بالکل یہ محسوس نہیں ہوتا، کہ اس کو شاعری کے ساتھ کوئی دلچسپی ہو گی۔ بس وہ اپنی غربت، بس کے کرایے، اور سگریٹ کے لئے پیسے نہ ہونے کے رونے روئے گا۔ عجیب بات ہے، کہ کبھی یہ نہیں کہتا، کہ میرے پاس شراب کے لئے پیسے نہیں ہیں۔ شائد اس کو علم ہے، کہ شراب کا نام لینے سے کسی کو اس کی غربت پر رحم نہیں آئے گا۔ ہاں، البتہ معمولی سگریٹ کے لئے پیسے نہ ہوں، یا بس کی ٹکٹ لینے کے لئے پیسے نہ ہوں، تو واقعی فنا ہونے والی بات ہے۔ نہیں؟

میں اُس کو خود ہی پنجابی شاعری کے بارے بتانے لگتی ہوں۔

پنجابی؟ کون لکھتا ہے، پنجابی میں شاعری؟

امرتا پریتم کا نام سُنا ہے، تم نے؟

او، امرتا! اس کو تو اس دفعہ میں مل کر آیا ہوں۔ اور اس کا کیا نام ہے؟ اس کے دوست کا! جو آرٹسٹ ہے۔

امروز۔

'او یس، ورٹ ایور، اور ساتھ اس کا بیٹا بھی ملا تھا، جو آرکیٹیکٹ ہے۔'

'ہاں، سیلی۔'

'ہاں ہیری لڑکی کو باہر سیر کرانے کے لئے لے گیا تھا۔'

'ہاں، وہ تو ضرور لے گیا ہو گا۔ اپنا ہنستی ہے۔'

جو ہین آسبرن کے ڈرامے پڑھ رہی تھی۔ ایک کردار کہتا ہے، آج کل کی عورتیں بھی کوئی عورتیں ہیں۔ ڈگر ڈگر چلتی ہیں۔ جگہ جگہ کام کرتی پھرتی ہیں۔ اُن میں گریس ہی نہیں رہی۔ ہمارے زمانے کی عورتیں ہوتی تھیں، کیا بات تھی اُن کی! گریس فل! اُن میں ڈگنٹی تھی، اور ہسٹری۔ جب کوئی عورت موٹر سے نیچے پاؤں رکھتی تھی، تو معلوم ہوتا تھا، وہ عرش سے نیچے اُتر رہی ہے۔ شی ڈیسینڈڈ! اور آپ بڑے ادب سے اپنا ہاتھ بڑھا کر اُس کو نیچے اُترنے میں مدد کرتے تھے۔ اور آج .... اور آج وہ اس طرح اُترتی جیسے جھٹکا دے کر بوری نیچے اُتاری جاتی ہے۔

سیلف ہیلپ والے کیفے میں سے میں اور مائیلو کافی اور ساتھ پائی، کا ٹکڑا لیتے ہیں، کاؤنٹر سے۔ مائیلو پیسے دیتا ہے۔ میں بھی اپنا پرس کھول رہی ہوں۔ وہ میرے ہاتھ میں ہی میرے پرس کا منہ بند کر دیتا ہے، ''آر یو اے وومن، آر اے لیڈی؟'' اور لاڈ سے ہنستا ہے۔

''اس کا کیا مطلب؟ وومن یا لیڈی؟ (جب بھی کوئی بات میری سمجھ میں نہ آئے میں پوچھ لیتی ہوں۔ جھجکنا کیوں؟ یہ کیا کوئی ہماری زبان ہے؟ زبان مختلف، کلچر مختلف۔ پوچھنے میں کیا ہرج؟)

یہ انگریز دراصل بڑی کمبخت قوم ہے۔ (وہ خود ہی اپنی قوم کا مذاق اُڑاتا ہے) اتنی کلاس کانشیسنیس ہے ان میں، اُکتو بہ۔ دُنیا کی اور کوئی زبان نہیں ہے، جس میں اس طرح کے دو لفظ ہوں، اور دونوں کا مطلب علیحدہ علیحدہ سماجی جماعت کے لئے جڑتا ہو۔ صرف انگریزی ہی ایسی زبان ہے، جس میں سوشل سٹیٹس نکھیڑنے والے لفظ ہیں۔ لیڈی ضرور کوئی ارسٹوکریٹک عورت ہوگی، کوئی کاؤنٹیس، کسی ایمبیسڈر کی بیوی، کسی لارڈ..... کی چاہے داشتہ ہی ہو۔ لیکن، ''وومن'' کام کاج کرنے والی، نچلے طبقے کی عورت ہوگی۔ اور یہ مان کر چلتے ہیں انگریز، کہ سلیقہ اور سگھڑپن، ناز و انداز،

اور گریس صرف اُونچے طبقے کی لیڈیز میں ہوتی ہے، دوسروں میں نہیں۔

یہی حال زبان کا ہے۔ اب انگریزی لینگوئج تو یہی ہے نا جو سب بولتے ہیں۔ لیکن بولنے کے لہجے سے پتہ چلتا ہے، کہ بندہ کون سے طبقے کا ہے۔ اُونچے آرسٹوکریٹک طبقے کا، یا نچلے مزدور طبقے کا۔ دُنیا کی اور کوئی زبان ایسی نہیں، جس کو مختلف طبقوں کے لوگ مختلف ایکسینٹ میں بولتے ہوں۔ یہاں پر تو بار، شراب فروخت کرنے والی لڑکی کے بولنے کے انداز سے پتہ چل جاتا ہے، کہ کسی اُونچے گھر کی ہے، مگر یہ مصیبت کی ماری یہاں نوکری کر رہی ہے۔ اور کسی لارڈ کی بیوی کی بات کے انداز سے، اس کے ایکسینٹ سے پتہ چل جاتا ہے، کہ اس لارڈ نے خاندان دیکھ کر شادی نہیں کی، کہیں کسی گوبر کوڑا کرکٹ اُٹھانے والی کو پھنسا کر لے آیا ہے۔

ویسے کہتے ہیں نا، کہ مغربی تہذیب بڑی فراخدلی سکھاتی ہے، اور بڑی ہی ترقی پسند نظریئے والی ہے۔ بالکل سکھاتی ہے، اور بڑی ترقی پسند نظریئے والی ہے۔ بالکل غلط! انگریزوں کی قوم تو بڑی ہی آرتھوڈاکس ہے۔ تمہارے ہندوستان کی ذات پات اور جانبداری کی طرح، یہاں سماجی اُونچ نیچ کا بھید بھاؤ بڑا زبردست ہے۔ یہی وجہ ہے، کہ ہر سال لاکھوں پونڈ انگریز قوم اپنی شہنشاہیت پر خرچ کرتی ہے۔ اور اس شہنشاہیت کے بڑے مہنگے تماشوں کے ساتھ انگریزوں کو عشق ہے۔ پرنس چارلس کی شادی پر لاکھوں لوگ دو دو دن اور دو دو راتیں نئے شادی شدہ جوڑے کی ایک جھلک دیکھنے کے لئے ننگے آسمان کے نیچے سڑکوں پر بیٹھے رہے۔ چارلس کے بیٹا پیدا ہُوا، تو پوری قوم بھنگڑے ڈالنے لگی۔ لڑکے کی کرسننگ کی رسم ہوئی، تو ساری قوم چاؤ میں پاگل!

یہاں پر آج کل 'اپرنا سین' کی ڈائریکٹ کی ہوئی فلم لگی ہوئی ہے ...

'ڈھرٹی سکس چورنگی لین'۔ جینیفر کپور، ششی کپور کی بیوی ہے۔ اور اس نے بڑی حساس اور کومل ایکٹنگ اس فلم میں کی ہے۔ میں نے یہ دہلی دیکھی تھی۔

لیکن یہاں جینیفر کو جینیفر کپور نہیں کہتے، جینیفر کینڈل کہتے ہیں۔ فلم میں، اشتہارات میں، سینما کے باہر یہی نام لکھا ہوا ہے۔

یہ بھی شائد یہاں فلم فروخت کرنے کا کوئی طریقہ ہوگا! ویسے تو طلاق کے بعد ہی عورت مائیکے کے نام کا استعمال کر سکتی ہے۔ لیکن جینیفر اور ششی کی تو بڑی محبت والی جوڑی ہے، پھر یہ مائیکے کا نام.....

اصل میں مغربی دنیا صنعت کی دنیا ہے۔ سب کچھ بکتا ہے۔ اور جو بھی جس طرح بھی بکے، وہی لیبل لگا دیں۔ سیانے بیوپاریوں کا یہی اصول ہے۔

خیر، اتنی خوبصورت فلم کو بھی یہاں کے اخبار ردی کر کے پھینکنے پر تلے ہوئے ہیں۔ فلموں کے ریویو کے لئے سب سے مشہور میگزین 'ٹائم آؤٹ'، جس کی کاپی ہر تھیٹر یا فلم دیکھنے والا، سنگیت سننے والا بندہ خریدتا ہے، اس فلم کے بارے لکھتا ہے، 'ڈائریکٹر سین نے اپنی اس پہلی فلم کو بڑے چالاکی سے پھیلانے کی کوشش تو کی ہے۔ جیسے 'آرٹی'، ایڈیٹنگ، سپنے، کلائمیکس، جو کسی اناڑی کا تخلیق کردہ معلوم ہوتا ہے۔ لیکن فلم میں کچھ ہو، تب ہی کھڑی ہو۔ فلم کو اس کی اُبھڑ اور سطحی سی اُداسی سے کینڈل کی ایکٹنگ نے ہی تھوڑا بہت اُبھارا ہے۔ بوڑھی کنواری عورت کے جذبات کو اس نے باریکی سے تراشا ہے۔ لیکن پھر بھی ایک فلم جو اپنے ملک میں فیل ہو گئی، مغرب سے اس کی تعریف کے لئے یوں ہی منت سی کی جا رہی ہے۔

اب اگر جینیفر کے نام کے ساتھ کینڈل نہ لکھا ہوتا، اور کینڈل خاندان یہاں پر اپنی ایکٹنگ کے لئے کافی مقبول ہے۔ جینیفر کی بہن فیلیسٹی ٹیلیویژن کی نامور ستارہ ہے، تو کیا بنتا؟ 'کینڈل' کی جگہ 'کپور' کو بھی یہ دو سطریں تعریف والی

مل سکتیں یہ بڑی شک والی بات ہے۔

ویسے اس دن گستاو کہہ رہا تھا، کہ یہ مغربی کریٹک اور مغربی اخبارات مانیں یا نہ مانیں، مگر پچھلے بیس برس سے ہندوستان کی طرف سے ایک طوفان آیا ہے، اور چھا گیا ہے، انگلینڈ کے آسمان پر۔ آسمان پر ہی نہیں، گلیوں میں، بازاروں میں، گھروں میں۔

اور یہ ہسٹری کا پہیہ ہے۔ کال چکر! تاریخ اپنے آپ کو دوہرا رہی ہے۔ کرائیسٹ کے پیدا ہونے سے کوئی چار سو سال پہلے، جو حالت روم کی تھی، وہی انگلینڈ کی پچھلی صدی میں تھی۔ خوشحالی، دبدبہ، شان عزت اور رباورہ۔ برٹش ایمپائر میں سورج غروب نہیں ہوتا تھا۔ روم میں بھی اس وقت سول ائیزیشن پورے جوبن پر تھی۔ پھر آہستہ آہستہ گراف کی لکیر نیچے آنے لگی۔ سب کچھ تہس نہس ہونے لگا۔ اولمپک دھرم آہستہ آہستہ مرنے لگے۔ شان وشوکت ختم ہونے لگی۔ لڑائیاں، جھگڑے، بھوک ننگ، بیکاری، غربت۔

اور پھر پورب کی طرف سے نئی اور نوکیلی تہذیب کی موجیں۔ یورپ کے کناروں کو بھگوتیں۔ یونان کی تہذیب پر چھاتیں۔ اور آئے نئے مذہب۔ عیسائی مذہب بھی پورب میں سے آیا، یوروشلم کی طرف سے، اور چھا گیا پورے یورپ پر، اور کرسچینیٹی کا سب سے بڑا تخت اسی روم میں بنا، جہاں کبھی اولمپک دھرموں کی شہنشاہی گونجتی تھی۔

اور اب پھر پورب کی طرف سے لہریں آکر انگلینڈ کے گلی کوچوں میں پھیل رہی ہیں۔

آج یہاں ہر گلی میں آپ کو یوگا کی کلاسز ملیں گی، ہر گلی میں گورو ملے گا۔

انگلینڈ کے لوگ اُبلیاں اور بیکڈ چیزیں کھانے والے لوگ، آج اپنی آدھی ڈشیں پیاز اور لہسن کے تڑکے لگاکر اور گوشت بھون کر بنا رہے ہیں۔ بھنے ہوئے کبابوں کی دوکانیں ہر گلی میں ہیں۔ چاہے وہ ہندوستانی کباب ہوں، یا عربی، یا گریک۔

ہندوستانی کپڑوں کے ساتھ زانڈرا رو ڈز جیسی فیشن کی شہنشاہ، نئے فیشن پیدا کر رہی ہیں، میموں کے لیئے۔ آکسفورڈ سٹریٹ میں کھڑے ہو کر دیکھیں، آدھی لڑکیوں نے ہندوستانی گھگریاں پہنی ہوتی ہیں۔

اور سر توڑ محنت کرنے والے ہندوستانی آہستہ آہستہ فیکٹریاں خرید رہے ہیں۔ آکسفورڈ سٹریٹ اور دوسرے فیشن ایبل علاقوں میں بڑے بڑے سٹور کھول رہے ہیں، ہول سیل بزنس کر رہے ہیں، ویئر ہاؤس بنا رہے ہیں، اخبارات چلا رہے ہیں۔ اور انگریزوں کو سکھا رہے ہیں، کہ کس طرح بیس سال میں پانچ پونڈ سے پچاس لاکھ پونڈ بنائے جاتے ہیں۔

لیکن اپنے پیارے ہندوستانیوں میں کئی لوگ اتنا کمال کر جاتے ہیں، کہ بڑے سے بڑا انگریز گورنر جنرل کو جب وہ ہندوستان میں گورنر جنرل ہوا کرتے تھے، مات دے جاتے ہیں۔ یعنی اس کی چالاکی کو، ہوشیاری کو، اور بے چارے غلام ملک ہندوستان کو لوٹنے والی اس کی مکاری کو۔ ابھی ابھی کوئی بتا رہا تھا، کہ فلاں نے انشورنس سے دو لاکھ پونڈ لیئے ہیں، چالاکی کے ساتھ۔ اپنی بیوی کی اس نے دو لاکھ پونڈ کی انشورنس کروائی ہوئی تھی۔ بیوی کو اس نے گاؤں بھیج دیا۔ وہاں سے اس کی لمبی بیماری کے، ہسپتال میں داخلے کے اور پھر اس کی موت کے سارے جھوٹے ریکارڈ بنوا لیئے۔ شمشان گھاٹ کا سرٹیفیکیٹ بھی۔ اور انشورنس کمپنی سے دو لاکھ

پونڈ لے کر عیش کر رہا ہے۔

لیکن اگر کسی دِن بیوی آدھمکی، تو پھر؟

بیوی کے ساتھ اُس نے وعدہ تو یہی کیا تھا، کہ دو لاکھ پونڈ ملنے کے بعد وہ چھ ماہ کے اندر اندر ہی ان کو ہندوستان پہنچا دے گا، اور آپ بوریا بستر باندھ کر گاؤں گاؤں چلا آئے گا۔ لیکن اب وہ کہتا ہے، کہ یہ تو پہلے سوچا ہی نہیں تھا، کہ دو لاکھ پونڈ کے ساتھ تو دس جوان لڑکیاں شادی کرنے کے لئے اس کی منتیں کریں گی۔ اس لیئے پُرانی بیوی سے بھی چھٹکارا مِلا، اور پیسے بھی مِل گئے۔ آج کل وہ نئی شادی کروانے کے لیئے لڑکیاں ٹٹولائی کر رہا ہے۔



"مجھے اب پوری فرصت ہے۔ بڑا لڑکا جیل چلا گیا ہے، چھوٹا
لڑکا ریفارم سکول اور درمیانی لڑکی گھر سے بھاگ گئی ہے۔"

عجیب بات ہے، میکسیکو کے اصلی شہریوں کو بھی "انڈینز" ہی کہتے ہیں۔ اور وہ بھی بالکل اپنے ہندوستانی دیہاتیوں جیسے معلوم ہوتے ہیں۔ سیدھے سادے! اور بچے بھی اپنے دیہاتوں کے بچوں جیسے، مویشی چراتے، کھیتوں میں کھیلتے۔ عورتوں کے کپڑے گجرات کے دیہاتوں کی عورتوں جیسے، کھلے گھگرے کڑھائی والے، کھلی رنگ برنگی چولیاں، اور پیچھے گندھی ہوئی چوٹیاں، مینڈھیاں۔ مردوں کے کپڑے چینی دیہاتیوں جیسے، سفید پاجامے، ٹخنوں سے اونچے، سفید کرتے اور سر پر سرکنڈا کے ٹوپ۔

اور اُن کا سب سے مشہور میلہ — وُڈری آف لائف کا۔

پہلے جنگل میں بہت سارے مرد، سب سے اونچا، سب سے مضبوط تنے والا درخت کاٹتے ہوئے، پوری گرمجوشی کے ساتھ۔ قریب ایک آدمی ایک چھوٹی سی ڈگڈگی بجاتا ہوا۔ درخت کے تنے پر پڑتے ہتھوڑوں کی چوٹ کو تال دیتا ہوا۔

درخت کاٹ کر، ٹہنیوں کی کٹائی کر کے وہ چھوٹا چھوٹا سا کچھ گاتے ہوئے درخت کے لمبے تنے کو اٹھا کر گاؤں کے درمیان چوک میں لاتے ہیں۔ ساتھ برابر ڈگڈگی بجتی جاتی ہے، ڈُم... ڈُم... ڈُم... ڈُم...

اور اس کو چوک کے درمیان میں لاکر گاڑ دیتے ہیں، اور بالکل اُوپر ایک ڈھول سا لمبوترا ڈھول۔

اس ڈھول کے گرد رنگ برنگے پھندنوں والے رسّے۔

اور پھر گاؤں کے چھ سات بندے، گاؤں کے سب سے تکڑے، سب سے خوبصورت گھبرو رنگ برنگے کپڑے پہنتے ہیں۔ اور چوکنوں والے ٹوپ، لال، پیلے، زرد، بینگنی۔ اور منہ پر رنگ ملتے ہیں، شوخ، چمکیلے۔

یہ گھبرو پنچھی بنتے ہیں۔ رب کے اپنے پنچھی!

اور پھر اُن رسّوں کے ساتھ لمبے درخت کے تنے کے اُوپر بندھے لمبوترے ڈھول کے ساتھ لٹکتے، رسّوں کے ساتھ جھولتے ہیں۔ گول گول لمبے، اُونچے بہت اُونچے درخت کے بالکل اُوپر، وہ ڈھول گھومتا ہے، گول گول، تیز تیز۔ اور اس کے ساتھ لٹکتے پھندنوں والے رسّوں کے سروں کو پکڑ کر، وہ لال، سبز، نیلے کپڑوں والے گھبرو چلتے ہیں، اُوپر، آسمان کے قریب، گول گول، گولائی میں، ہوا میں۔

اور سارا گاؤں نیچے کھڑا ہو کر گاتا ہے، ہم تیرے پنچھی ہیں، اے خدا! زندگی کے درخت پر ہمیں گانے دے! اے خدا، ہم کو آزاد اُڑنے دے! ہم تیرے رنگ برنگے پنچھی ہیں، اے خدا!

یہی اُن کی عبادت ہے۔

انگلینڈ کا کنٹری سائیڈ بڑا ہی خوبصورت ہے۔ بھری گولائیاں برابر ہاور سبز اُبھار، ہلکے ہلکے۔ تھپتھپانے کو دل کرتا ہے۔

جیسے سبز رنگ کی ملائم لہریں ہوں۔

چھوٹے چھوٹے آہستہ آہستہ اُوپر جاتے، اور نیچے اُترتے ٹیلے، یا چھوٹی چوٹی

ٹبیاں سی۔ اور دُور سب سے پیچھے دکھائی دیتے ہیں۔ اوپر اگر کوئی درخت ہوں، تو آسمان کی پگھلی ہوئی روشنی کے پس منظر میں قافلے کی طرح چلتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔

بہت وشنیسواس، یہ ہلکے ابھار بے حد خوبصورت ہیں۔ ہرے سبز! دُور سے بالکل سبز ریشم سے ڈھکے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔

اور اگر کسی گاؤں میں داخل ہو جائیں، تو گھر بھی لندن جیسے، کاریں بھی لندن جیسی۔ صرف سب کچھ بالکل شانت اور خاموش۔ اور باقی نہ شہروں سے سڑکیں علیحدہ ہیں، نہ مکان۔ صرف ماحول پُر سکون ہے۔ سڑکوں پر موٹریں کم دوڑتی ہیں، لوگ بھاگتے دوڑتے نظر نہیں آتے۔ اور کوئی فرق نہیں۔ دوکانیں، پب، کیفے، سینما وغیرہ بڑے شہروں کی طرح سب موجود۔

اور یاد آتے ہیں، اپنے ہندوستان کے گاؤں۔ او خدایا!

آپ نے تو پنجاب کے گاؤں تو دیکھے ہی ہوئے ہیں، خوشحال۔ لیکن میں نے وہاں بڑے گاؤں دیکھے ہیں، گجرات کے، بہار کے، اڑیسہ کے، آسام اور ناگالینڈ، اور مدھیہ پردیش کے۔ کسی بھی گاؤں میں جانے کے بعد، کئی دن اپنے کپڑوں سے، اپنے گھر سے، اپنی موٹر سے اور اپنی خوشحالی سے شرم آتی رہتی ہے۔

اتنی غضبناک، خوفناک بھوک اور غریبی دیکھ کر مر جانے کو دل کرتا ہے، کیونکہ آپ اور کچھ نہیں کر سکتے۔ نہ آپ کے پاس اُن کی زندگی کو سُدھارنے کا کوئی وسیلہ ہے، اور نہ ذریعہ۔ اور جن کے پاس وسیلے ہیں، پاور ہے، ذرائع ہیں، وہ انگلینڈ میں انڈیا فیسٹیول کروا رہے ہیں، تاکہ یہاں ہندوستان کا امیج، یہاں ٹھیک ہو۔

بھوک، جو پیٹ کے گڑھے سے شروع ہو کر آنکھوں میں بھی کالے اندھیرے کے گڑھے کھود دیتی ہے۔ غریبی، جو بمشکل ایک گز کی میلی کچیلی دھوتی میں اپنا تن ڈھانپنے کی ناکام کوشش کرتی ہے۔ غریبی، جو بچوں کو علاج نہ ہونے کی وجہ سے اپنے بازوؤں

میں مرتا دیکھنے کو مجبور رہے۔ غریبی، جو موت کو روزانہ آپ کے گھروں کی چوکھٹوں میں لا کھڑا کرتی ہے، اور آپ کا، سارے گھر کے افراد کا پورا زور، ہر روز، ہر روز اس کو چوکھٹوں سے ذرا پرے ہٹانے میں لگ جاتا ہے۔

لیکن کچھ لوگ ایسے بھی ہیں، جو غریبی، گھور، بدحواس غریبی میں رہ کر بھی مست ہیں۔ یہ تھوڑی سی ٹرائیبز ہیں، جو مدھیہ پردیش اور گجرات کے دور اندر جنگلی علاقوں میں رہتی ہیں۔

میں اور ارپنا ان گرمیوں کے شروع میں گجرات کے ان جنگلی علاقوں میں گئی تھیں۔

کسی بھی چھوٹے سے چھوٹے قصبے سے، کسی بھی سڑک سے، کسی بھی کچے راستے سے کم از کم بیس پچیس میل اندر جنگلی علاقے میں جاکر ان ٹرائیبل لوگوں کی، جن کو قدیمی آباد کار کہتے ہیں (کیونکہ ہندوستان میں زمانہ قدیم سے رہنے والی یہ قومیں مانی جاتی ہیں، باقی آرین تو باہر سے آئے لوگ تھے۔ جیسے امریکی، سارے باہر سے جاکر آباد ہو گئے، اور اُن کے قدیمی آباد کار ہیں، ریڈ انڈین۔)

چھوٹی چھوٹی ٹکڑیاں شروع ہوتی ہیں۔ ایک ٹکڑی میں عموماً ایک ہی کنبہ کے دو تین کچے گھر ہوتے ہیں۔ زمین بڑی ظالم ہے، پتھریلی۔ انگلینڈ کے دیہاتی علاقوں کی طرح ہی چھوٹی چھوٹی ٹھگنی ٹیاں، لیکن یہ ٹبیاں سبز نہیں مٹیالی ہیں۔ ان لوگوں کے پاس اپنے بازؤں کے علاوہ اور کوئی ذریعہ نہیں، جن سے وہ ان ٹبوں کے نیچے سخت، پتھریلی دھرتی کو نرم کر لیں۔ جو بھی کم زیادہ اُگتا ہے، ان ہی پتھروں سے اور مٹیالی دھرتی سے۔ عموماً موٹا چاول۔ لیکن جتنا چاول وُہ پیدا کرتے ہیں، وہ پیٹ بھرنے کے لئے کافی نہیں ہوتا، اور اس کی کمی وہ پوری کرتے ہیں، تاڑی سے۔

تاڑی کے درخت، جنگلی درخت بہت ہیں۔ ان درختوں پر چڑھنا ہر بچہ یہاں

کے پیٹ میں سے ہی سیکھ کر پیدا ہوتا ہے۔ چیونٹی کی طرح یا ٹڈے کی طرح وہ درخت پر چڑھ جاتے ہیں۔ کمر کے ساتھ چھوٹی سی گھڑولی اور چاتری باندھ کر۔ اوپر جا کر درخت میں ٹک لگاتے ہیں، اور ساتھ وہ چھوٹا گھڑا باندھ دیتے ہیں۔ درخت کے تنے میں سے کچّی لسّی کے رنگ کا پانی نکلتا ہے۔ تازہ نکلے پانی الائچی کے رس جیسا ہوتا ہے، ہلکا میٹھا، اور ہلکا سا نشیلا۔ لیکن ہر گھنٹے بعد اس میں تیز ابی نشہ سا پیدا ہوتا جاتا ہے۔ ایک دن پہلے نکالی گئی تاڑی اگلے روز رم سے بھی زیادہ تیز ہو جاتی ہے۔

اور یہ لوگ مرد، بچے، عورتیں سب صبح سے لے کر رات تک تاڑی پیتے رہتے ہیں۔

چاول کبھی گھر میں ہوتا ہے، کبھی نہیں ہوتا۔

جب چاول ہو، اس کو پکا کر تاڑی میں ملا کر کھاتے ہیں۔ یہ بہت ہی شاہانہ کھانا ہے۔ تہواروں پر، میلوں پر، اور خوشی کے خاص موقعوں پر کھانے والا بھوجن، تاڑی میں بھیگے چاول۔

ہاں، جب کوئی مہمان آجائے، تو اپنے چھوٹے چھوٹے مرغ، جو بالکل چڑیوں جیسے چھوٹے ہوتے ہیں، خوراک نہ ملنے کی وجہ سے۔ ان کو مار کر کپاس کی منھیٹیوں کی آگ پر بھون کر کھلاتے ہیں۔ یہی ان کی بادشاہی کا وقت ہوتا ہے۔

اور اُن کو معلوم ہو جائے، کہ آنے والا مہمان موٹر پر آیا ہے، تو میلوں کے میل ساتھ پیدل چل کر اُس کو موٹر میں بٹھانے کے لیئے جاتے ہیں۔ (موٹر کبھی بھی گاؤں تک نہیں جا سکتی۔ راستہ ہی نہیں۔ موٹر کو نزدیک ترین گاؤں سے بھی بیس پچیس میل دُور کچّی سڑک پر کھڑا کرنا پڑتا ہے۔) تاکہ بچے موٹر کے جسم کو چھو کر دیکھ سکیں، اور عورتیں اور مرد گھیر کر کے اس کو چلتے دیکھ سکیں۔

لیکن عجیب بات ہے، کہ ان لوگوں کے چہروں پر بھوک نہیں۔ عجیب مطمئن چہرے ہیں۔ اپنے حال میں مست۔ اپنے پرانے دلگڑوں، میں لپٹے ہوئے۔ پتھریلی زمینوں کے پیٹ میں سے چاول نکالتے۔ درختوں سے تاڑی نچوڑتے، اور مست۔

انگلینڈ کے دیہاتوں کو دیکھ کر، یہ جنگلوں میں بسے چھوٹے چھوٹے دیہات بہت یاد آتے ہیں۔

بڑے اسٹوروں میں پورے کے پورے کاؤنٹر، یعنی ایک دیوار سے دوسری دیوار تک لمبی، اور فرش سے چھ چھ سات سات فٹ تک اونچی الماریوں کے شلیف کتوں اور بلیوں کی خوراک کے ڈبوں سے بھرے پڑے ہیں۔ ہر ڈبے کے اوپر لکھا ہے، کہ اس میں بند خوراک، یعنی کئی اقسام کی مچھلی، خرگوش کا ماس، قیمہ پکا کر نرم کیا ہوا گوشت ـــ میں کتنی پروٹین ہے، اور کتنا کیلشیم ہے۔

ہر گھر میں کتے بلیاں تو ہیں ہی۔

اور ہر فرد اپنے کتوں کو بلیوں کو صبح اور قسم کا گوشت کھلاتا ہے، دوپہر کو اور قسم کا، رات کو اور قسم۔ اور کوئی بھی گوشت کو دوسرے دن ریپیٹ، نہیں کرتا، کیونکہ "ڈونٹ دے لوز دیئر اپیٹائیٹ اف یو ڈونٹ گو اے ورائٹی ان دیئر فوڈ ز ڈیئر؟ آئی مین ہو وڈ لائیک ٹو ایٹ دی سیم تھنگ اگین اینڈ اگین؟ ان تھنک ایبل آف کورس؛

اور میں ان سب غریب بچوں کے بارے میں سوچتی ہوں، جو آدھی سے زیادہ دنیا میں رہتے ہیں، اور محض پیٹ بھرنے کے لئے کچھ بھی کھا لیتے ہیں، صبح بھی وہی، رات کو بھی وہی۔ اگلے دن بھی وہی۔ اگلے ہفتے، اگلے مہینے، اگلے سال بھی وہی۔

اور ان تمام بچوں کے بارے، ساری دُنیا میں پھیلے ہُوئے بچے، جو بھُوکے ہی سو جاتے ہیں۔

اور وہ سارے بچے، لاکھوں کروڑوں بچے، جن کو پوری خوراک نہ ملنے کی وجہ سے پچاس قسم کی بیماریاں شروع ہو جاتی ہیں، ٹیڑھی ٹانگیں، سُوکھاپن، بڑھا ہُوا پیٹ غبارے کی طرح، پولیو، ملیریا، تپدق، اندھاپن۔

اور اُن کروڑوں آنکھوں کے بارے، کالے ادھُورے اور زرد چہروں میں سے جھانکتی آنکھیں، جن میں سے بھُوک راکھ کی طرح گرتی ہے، خوفناک دہشت کی طرح جھانکتی ہے۔ ننگی بھُوک کے پھڑپھڑاتے چمگادڑ، جن کی آنکھوں میں سے رات اندھیرے میں ہی نہیں، دِن کی سفید روشنی میں بھی پھڑپھڑاتے ہُوئے اُڑتے ہیں اور پھر بھٹک کر واپس آکر آنکھوں میں اُلٹے لٹک جاتے ہیں۔

گُستاو اور رگابی اور سفیٹی میز کے گرد بیٹھے پنیر کھا رہے ہیں۔ ساتھ میں اور اپنا اور ایک پنیر ٹرہرمن، جو دس سال پہلے دو سال ہندوستان رہ کر آیا ہے۔

بات پنیروں سے شروع ہوتی ہے، کہ پنیر ذائقے سے بنانے اور کھانے والی قومیں بہت کم ہیں۔ سب سے زیادہ فرانسیسی۔ سینکڑوں اقسام کے پنیر۔ اور پنیر بھی وائن کی طرح پُرانے کیے جاتے ہیں۔ کم از کم نو دس ماہ پُرانے ہیں۔ پُرانے میں ہی ذائقہ اُبھر کر آتا ہے۔ اور پھر یا ہالینڈ میں پنیر بنتے ہیں۔ پڑوس میں بلجیم ہے، مگر وہاں کوئی پنیر نہیں۔ اگر دو چار قسموں کا ہُوا بھی، تو کیا ہُوا۔ پنیر کھانے والی قومیں تو سینکڑوں قسمیں بناتی ہیں۔ پنیروں کی، اور پھر اُن پُرانی وائن ہی کی طرح ذرا ذرا کر کے ذائقے سے لطافت سے کھاتی ہیں۔ رُوس اتنا بڑا مُلک ہے، وہاں پنیر نہیں بنتا۔ امریکہ، تو بڑا تیس مار خاں ہے، لیکن پنیر کے معاملے میں زیرو۔

پنیر بنانا اور کھانا، یہ بڑی سلیقے والی قوموں کی نشانی ہے۔

اور بات پنیر سے شروع ہو کر قوموں کے سلیقے کے ساتھ، لطافت کے ساتھ اور آخر میں 'کلچرل ٹریڈیشن' کے ساتھ جُڑ جاتی ہے۔

گستاو، جو کلا کا بابا وغیرہ ہے، کہتا ہے، کہ ہالینڈ کیونکہ بڑا ہموار علاقہ ہے، اسی لئے وہاں پر اُگا ہوا درخت بھی 'رائیٹ اینگل' بناتا ہے۔ اسی لئے وہاں پیدا ہوئے زیادہ تر آرٹسٹوں کے کلا کے نمونوں میں، خاص کر 'لینڈ سکیپس' میں، رائیٹ اینگل ہوتے ہیں۔ کیمرا کے بعد سب سے مشہور اور 'ایمپارٹنٹ' جو آرٹسٹ ہُوا ہے، وہ تھا، موندرین۔ پہلی جنگِ عظیم کے بعد ہالینڈ کی ٹیولپس پھولوں سے ڈھکی وادیوں کو بھی جب اُس نے مصوّر کیا، تو اُن میں اینگل بنا کر۔ ایک ٹکڑے کے بعد دوسرا ٹکڑا، کمال۔

ہالینڈ میں زندگی کی بڑی 'کنزرویٹو ٹریڈیشن' رہی ہے۔ ہمیشہ۔ لیکن بیسویں صدی کے درمیان، دوسری جنگِ عظیم کے بعد سب اُلٹ گیا۔ اس ناک کی سیدھ چلتی ڈھکی، لپٹی زندگی کے خلاف جیسے 'ری ایکشن' آیا۔ بغاوت! سیدھے سادے گرجے جانے والے، خدا اور مذہب کے ساتھ چلنے والے لوگوں نے زندگی کا رُخ بالکل اُلٹ دیا۔ نتیجہ؟ سب سے پہلے ہالینڈ ہی ایک ایسا ملک تھا، جہاں 'ہوموسیکسوئل' لوگوں نے باقاعدہ شادیاں کیں۔ سیکس گلیوں میں آ گیا، یعنی بالکل گلیوں میں، سڑکوں پر۔

لیکن انگریز قوم نے اپنی 'جنٹلمینلی نیس' کو ابھی تک بچا کر رکھا ہُوا ہے۔

ہندوستان سے تو ہر بندہ یہی سوچ کر انگلینڈ آتا ہے، کہ بس، وہاں تو گوریاں بھوسے کے مُول ملتی ہیں۔ جس گوری لڑکی پر اُنگلی رکھ دیں، وہ میمنے کی طرح ساتھ چل پڑتی ہے۔ اور کوئی بھی عورت چاہے، جس کے ساتھ بھی پھرے، کسی کے ساتھ بھی سوئے، اس کا خاوند مُنہ دوسری طرف پھیر لیتا ہے۔ اور مرد چاہے، جو کچھ بھی

چاہے اگر ے، بیوی کو کوئی پرواہ نہیں۔

مگر نہیں، یہاں تو بہت پرواہ ہے۔ بلکہ ہندوستان سے بھی زیادہ پرواہ۔ صرف یہاں بلکہ عام انسان کی زندگی میں بہت سچائی ہے۔ زیادہ ایمانداری ہے۔ کام میں، سڑکوں پر، گھروں میں، گھریلو زندگی میں، روزمرہ کی زندگی میں۔ اور ایمانداری اس میں ہی نہیں ہوتی، کہ ایک مرد کے بعد دوسرے کی طرف بالکل نہ دیکھو، یا کسی دوسری عورت کے ساتھ بات بھی نہ کرو۔ بلکہ اس میں ہوتی ہے، کہ اگر کوئی دوسری عورت اچھی لگنے لگی ہے، اور اس کے ساتھ کوئی قریبی رشتہ جڑ گیا ہے، تو ایمانداری کے ساتھ اپنی پہلی بیوی کو بتادیں، اور علیحدہ ہو جائیں، اور ایمانداری سے نئے رشتے والی بیوی کے ساتھ رہیں۔

تو ایمانداری کے معنے ہر قوم کے پاس، ہر ملک میں علیحدہ ہوتے ہیں۔ جس طرح خوبصورتی کے معنے، جس طرح موریلٹی کے معنے، جس طرح قربت کے معنے۔

اور ہالینڈ کا انگلینڈ پر بہت زیادہ اثر ہے۔ سترھویں صدی میں انگلینڈ پر ہالینڈ کی ڈائینسٹی کی حکومت رہی ہے۔ یہ جو انگلینڈ میں اٹھارویں صدی کے شروع کا آرکیٹیکچر نظر آتا ہے، خصوصاً بلومزبری کے علاقے میں، جہاں آج کل ہم رہ رہے ہیں، ان کم سے کم ڈھائی سو سال پرانے مکانوں کا آرکیٹیکچر ہالینڈ سے ہی آیا تھا۔ ہالینڈ کی ہموار دھرتی میں پتھر کوئی نہیں، اس لئے وہ مکان اینٹوں سے ہی بناتے ہیں۔ اور سیدھے، بالکل سیدھی دیواریں۔ نہ محرابیں، نہ چھجے، نہ گیلری، نہ کوئی اور جڑت مڑت۔ وہی رائیٹ اینگل والی جھلک۔

اسی کے زیرِ اثر انگلینڈ میں بھی ڈھائی سو سال پہلے کے بنے ہوئے مکان بالکل سیدھے ہیں۔ نہ چھجے، نہ محرابیں، نہ ستون۔

ویسے ستون گریک آرکیٹیکچر سے آئے ہیں، یورپ میں بھی اور انگلینڈ میں بھی۔

بیرونی برآمدے جیسی اُونچی چھت کے نیچے موٹے گول سے ستون، اور ستونوں کے اُوپر سروں پر بیل بُوٹے۔ برآمدوں کی اُونچی، بہت اُونچی چھت عموماً تکونی۔ اس گریک قسم کی بنی ہُوئی بلڈنگیں بھی، سارے لندن میں (اور سارے انگلینڈ میں) پھیلی ہُوئی ہیں۔ مارلیبان روڈ پر، ٹریفالگر سکوائیر کے آس پاس، وکٹوریہ کی طرف، ماربل آرچ کے آس پاس، اور خود ماربل آرچ بھی! اور کئی ایک!

لیکن ہالینڈ کے ڈچ آرکیٹیکچر کے زیرِ اثر مکان لازمی طور پر اینٹوں کے بنے ہُوئے ہیں۔

لندن کی رہائشی بستیوں کے ماچس کی تیلیوں جیسے مکانوں سے علیحدہ بھی، اور کسی حد تک نہ علیحدہ بھی۔

بعد میں آئے کاربوزیئے وغیرہ کی آرکیٹیکٹوں نے اس پُرانے آرکیٹیکچر سے، دراینپیریشن، لیا معلوم ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے، کہ چندی گڑھ کے آرکیٹیکچر کی شکل و شباہت اس ڈھائی سو سال پُرانے آرکیٹیکچر سے ملتا ہے۔ لندن کی پُرانی عمارتوں کے ساتھ، اور ہالینڈ کی عمارتوں کے ساتھ۔

ہر قوم کا ایک وقت جاہ و جلال کا ہوتا ہے، اور پھر زوال کا۔ آج تک کی تاریخ پر نظر ڈالیں، ہمیشہ یہی ہوتا آرہا ہے، کلا میں بھی، اقتدار کی طاقت میں بھی۔ گراف کی لائین کبھی اُوپر جاتی ہے، کبھی نیچے۔

عجیب بات ہے، انگلینڈ کی کلا کا عروج اٹھارویں صدی کے درمیان سے اُنیسویں صدی کی پہلی تہائی تک رہا۔ کلاکار، عمارت کار، بُت تراش، سب ان اسّی برسوں میں کمال حاصل کر گئے۔

اور ۱۸۳۰ء سے شروع ہُوا، ملکہ وکٹوریہ کا زمانہ۔ انگلینڈ کی اقتدار کی طاقت

دُنیا کے چاروں کونوں میں پھیل گئی۔ یہاں تک کہ انگلش ایمپائر پر سُورج کبھی ڈوبتا نہیں تھا۔ کا دُنیاں، اقتدار کی طاقت کا پھیلاؤ۔ مگر کلا کا سُورج غروب۔

اس زمانے میں باہر سے بُت اور پینٹنگز اور دوسرے کلا کے نمونے لُوٹ کر لاتے رہے، اور اپنے میوزیم بھر لیئے۔ مصر سے، ہندوستان سے۔ طاقت کی، جاہ و جلال کی مثال۔ برٹش میوزیم، ٹاور آف لندن، اور کئی جگہوں پر یہ لُوٹ کا مال پڑا ہے۔

لیکن اس زمانے میں ان کے اپنے برٹش کلاکاروں نے کوئی یادگار شاہکار پیدا نہیں کیئے۔

اور پھر زوال اقتدار کی طاقت کا بھی۔ بیسویں صدی کے آغاز سے لے کر بیسویں صدی کے درمیان تک آہستہ آہستہ سب تھوڑا تھوڑا کر کے گر گیا۔ اور رہ گیا، صرف لُوٹ کا مال!

کئی ملک اپنے ان بُتوں، ان تاریخی کلا کے نمونوں، نوادرات کو واپس کرنے کے لیئے زور لگا رہے ہیں۔ پچھلے دنوں مصر سرکار کے کچھ نمائندے یہاں بات چیت کرنے کے لئے آئے ہوئے تھے۔ لیکن اس طرح محنت سے لُوٹ کر، اور جہازوں میں لاد کر لائے ہوئے یہ چھت جتنے اونچے اور صدیوں پُرانے بُت جناب کون واپس کرتا ہے؟ اگر آج ایک ایک ملک کو واپس کرنے لگیں، تو کل کو سارے ملک، جہاں جہاں پر انہوں نے راج کیا ہے، اپنی اپنی چیزیں لینے آدھمکیں گے۔

مصر سرکار کے نمائندوں کو اُنہوں نے کہا، یہ تمہارے بُت تو برباد ہو رہے تھے۔ کچھ تو ایسی جگہ پر تھے، جہاں پر آپ نے گولے بارود کا گودام بنایا ہُوا تھا۔ اگر ہم ان کو لا کر نہ سنبھالتے، تو اب تک انہوں نے ٹھیکرے ہو جانا تھا۔

بھئی، کتنی سیانی ہے، انگریز قوم۔ یہ ماننا پڑے گا۔

باقی ملک تو صدیوں پہلے کلا کے ان نمونوں کی صرف تخلیق کر سکتے تھے۔ اور کچھ صدیاں وہ ویسے ہی محفوظ رہے با اتفاق سے۔ لیکن دو سو سال پہلے اگر ان کو انگریز نہ سنبھالتے، وہ بھی یہاں ٹھنڈی جگہ لا کر، تو کیا انہوں نے مٹی نہیں ہو جانا تھا؟

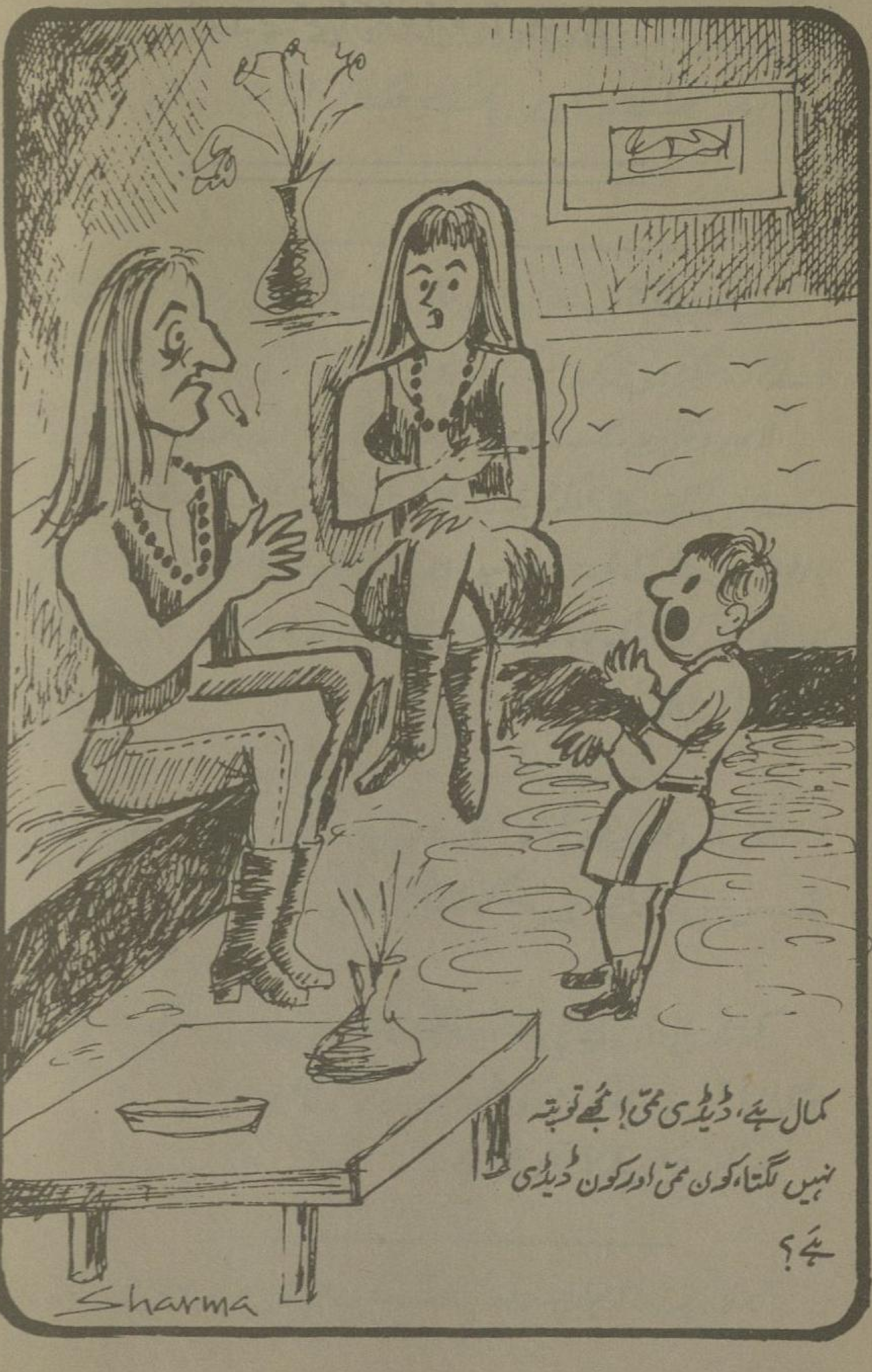
ویسے پہلے وکٹوریہ نے جن جن ملکوں سے یہ صدیوں پرانے کلا کے شاہکار لائے، وہ سینکڑوں چوکوں میں، چوراہوں میں اور باغوں میں یہ بُت لگوا دیئے۔ لاہور وکٹوریہ کے بُت کا بڑا کالا سایہ مجھے ابھی تک یاد ہے۔ اس کو ہم وکٹوریہ کا بُت نہیں کہتے تھے، ملکہ کا بُت کہتے تھے۔ ملکہ کے بُت کے قریب دیال سنگھ کالج تھا۔ اور ملکہ کے بُت سے سیدھے چلتے جائیں، تو میرا اسکول تھا۔ جہاں امرتا پریتم کے والد گیانی کرتار سنگھ ہتکاری پنجابی پڑھاتے تھے، اور امرتا سالانہ جلسوں میں آکر ستار بجایا کرتی تھی۔

اور ملکہ وکٹوریہ خود سکیچ کرتی تھی۔ اس کی ڈرائنگ کی کتاب میں نے دیکھی ہے۔ اس میں مہاراجہ دلیپ سنگھ کے سکیچ بھی ہیں۔

کچھ تاریخ داں کہتے ہیں، کہ ملکہ وکٹوریہ کو نوجوان دلیپ سنگھ کے ساتھ عشق ہو گیا تھا۔ قریب بٹھا کر اس کی تصویریں بنایا کرتی تھی۔
یہ کھوج کرنے کا موضوع ہے۔

حیران ہوں، کہ مہاراجہ دلیپ سنگھ کے بچے بھی اس ملک میں ہوں گے۔

شائد اب بوڑھے ہو گئے ہوں ۔ اُن کے بچّے بھی ہوں گے ۔ یہاں کے کئی پنجابیوں سے پوچھا ہے ۔ کبھی اُن کو کوئی بھی جا کر نہیں مِلا ۔


کمال ہے، ڈیڈی ممّی! مجھے تو پتہ نہیں لگتا، کون ممّی اور کون ڈیڈی ہے؟
Sharma

فلم دیکھ کر آئی ہوں، ومحون لائیٹنگ۔

پولینڈ سے چار افراد آئے ہیں، انگلینڈ میں کام کرنے کے لیے۔ اُن کے 'باس' نے اُن کو لندن بھیجا ہے۔ لندن میں باس پُرانے بوسیدہ مکانات خریدتا ہے، سستے۔ مرمت کرانے کے لیے یا گرا کر بنانے کے لیے انگریز مزدور بڑا مہنگا پڑتا ہے۔ اس لیے اپنی فیکٹری میں کام کرتے چار آدمیوں کو ایک ماہ کی چھٹی دے کر، اور بارہ سو پونڈ دے کر لندن روانہ کر دیتا ہے ــــ "جاؤ، ایک ماہ میں مکان گرا کر دوبارہ بنا کر آؤ۔ سامان کے لیے، تمہاری روٹی کے لیے، گھر بنانے کے لیے، نئے فرنیچر کے لیے، یہ بارہ سو پونڈ۔ باقی کیل کانٹے یہاں مہنگے ہیں، یہاں سے لے جاؤ۔"

اور جو اس گروپ کا لیڈر ہے، اس کی بیوی پر بھی باس کی آنکھ ہے۔

خیر، صرف اسی ایک ہی آدمی کو تھوڑی بہت انگریزی آتی ہے۔ باقی تینوں بے چارے جانوروں کی طرح کام کر سکتے ہیں۔

اُن کو دیکھ کر، پرائی دھرتی پر آ کر زندگی کے لئے جدوجہد کرتے دیکھ کر، اٹھارہ اٹھارہ گھنٹے سر توڑ محنت کرتے، اور مٹی کے ساتھ مٹی ہوتے دیکھ کر بس اپنے پنجاب کے دیہاتوں سے آئے لوگ آنکھوں کے سامنے آ کھڑے ہوتے ہیں

یہ مسئلہ سب کا مشترکہ ہے۔ پرائی دھرتی، اور پرائے لوگوں میں جا کر روٹی

کمانے کا مسئلہ - اُن لوگوں میں جن کی بولی بھی آپ کو نہ آتی ہو - اُن لوگوں میں جو ہر وقت آپ کو حقارت کی نظروں سے دیکھتے ہوں۔

یہ لوگ جہاں بھی جاتے ہیں، چاہے باہر ہفتہ میں ایک بار ہی جاتے ہیں - کیونکہ کام ہی اتنا زیادہ ہے، کہ فرصت ہی نہیں، چھٹی بھی ایک ہی ماہ کی ہے، اور ویزا بھی ایک ہی ماہ کا ملا ہے، اور وہ بھی اس لئے، کیونکہ ان کی جیب میں بارہ سو پونڈ تھے، اور کہا اُنہوں نے یہ تھا، امیگریشن والوں کو، کہ ان بارہ سو پونڈ کے ساتھ سیر کرنے آئے ہیں، جہاں بھی جاتے ہیں، یا تو لوگ مذاق سے اُن کی طرف دیکھتے ہیں، اور یا شک کی نگاہوں سے - کبھی کبھی حقارت سے۔

اور اُن کی ایک ماہ کی زندگی کو فلم میں جس خوبی سے ڈائریکٹر نے پیش کیا ہے، کمال ہے۔

کیونکہ اُن کو سب سٹوروں والے ہمیشہ شک کی نظروں سے دیکھتے تھے - جہاں بھی وہ گھر بنانے کا سامان یا کھانے پینے کا سامان خریدنے جاتے تھے، وہ شک اور وہ حقارت کم از کم گروپ لیڈر کو اتنا ڈھیٹ بنا دیتی ہے، ڈھیٹ اور کچھ کچھ بدلہ لینے کی خواہش، کہ جب پیسے ختم ہونے لگتے ہیں، تو وہ واقعی سٹوروں میں سے چوری کرنے لگتا ہے - تمہاری ایسی کی تیسی، ایک ایماندار اور محنت کش بندے کی طرف اس طرح آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتے ہو، تو لو، یہ بھی لو۔

سب آہستہ آہستہ اپنے مزدوری کے پیسوں سے ہر سنیچر وار کو چھوٹی چھوٹی چیزیں خریدتے ہیں، اُن چار گھنٹوں میں، جو اُن کو باہر جانے کے لئے ملتے ہیں - بچوں کے کپڑے، بیویوں کے لئے سوغاتیں، گھڑیاں، ٹیلیویژن، ریڈیو - اور رسک رہے ہیں، اپنے بال بچوں میں واپس جانے کے لئے۔

اور تب ہی پولینڈ میں ملٹری بغاوت کر دیتی ہے۔ 'کو'، راستے بند، فلائیٹیں

بند، تار، ٹیلیفون اور خطوط بند۔ لیکن اس کا علم صرف گروپ لیڈر کو ہوتا ہے۔ اور باقی تینوں سے وہ یہ خبر چھپاتا رہتا ہے، تاکہ وہ اپنے بال بچوں کی فکر میں کام کاج ہی چھوڑ کر نہ بیٹھ جائیں۔ خود رات بھر جاگتا ہے، اور پولینڈ کی خبریں ڈھونڈتا ہے۔

آخر رستے کھل گئے۔ ہوائی جہاز آنے جانے لگے۔ مہینہ پورا ہو گیا، اور انہوں نے واپس جانے کی تیاری کر لی۔ ملبے کی جگہ پر نیا مکان بنا کر، بنا سنوار کر، قالین بچھا کر، اور وال پیپر لگا کر، تالا لگا کر، جب وہ پھر وائیر پورٹ کی طرف روانہ ہوئے، تو ان کے پاس صرف پانچ پینی کا ایک سکہ تھا۔ اسی لیئے چھوٹی چھوٹی ریڑھیوں میں انہوں نے اپنا شوق سے خریدا ہوا سامان رکھ لیا، اور چھ میل دور ائیر پورٹ کی طرف روانہ ہو گئے۔

پھر وہ کے قریب پہنچ کر گروپ لیڈر نے سوچا کہ اب پولینڈ میں ہوئی گڑبڑ کی بات ان کو بتا دینی چاہیئے۔ ورنہ ایروفلوٹ کے ہوائی جہاز میں جب پولش اخبار پڑھیں گے، تو گالیاں نکالیں گے۔

اور وہ سڑک پر کھڑا ہو کر رات کے اندھیرے میں ان کو خبر سناتا ہے۔

اور پھر.... جس طرح وہ جنوں کی طرح کام کرنے والے اتنے تگڑے آدمی پاگل ہو جاتے ہیں، جس طرح وہ گیلے آٹے کے گڈوں کی طرح دسلنپ، کرتے ہیں، ہمت ہار کر وہیں بیٹھ جاتے ہیں، اندھیری سڑک کے درمیان، اور جس طرح وہ محنت سے کمائے اور شوق سے خریدے سامان کی ریڑھیاں لڑھکتی لڑھکتی دور چلی جاتی ہیں، کیونکہ ان سے ان چاروں آدمیوں کا موہ ٹوٹ گیا ہے، وہ سنناٹا کی انتہا ہے۔ شور شرابا نہیں، حال دہائی نہیں، چیخ پکار نہیں، ہندی فلموں کی طرح۔

تڑکے کتوں کے ساتھ، اندھیری سڑک پر گرتے انسانی چہرے، اور ریڑے

وہ لڑھکتی ریڑھیاں ۔ بس ۔

پت جھڑ کا موسم!

ہائی وے پر ڈرائیو کرتے آس پاس کے کھیتوں کی سبز ڈھلانوں کے اُتار چڑھائی رنگ بدلتے نظر آتے ہیں ۔

کہیں بھُوری، سبز گھاس، سبز دریائی کی طرح کھیتوں کی دُلہنوں کے نشیلے مہکتے جسموں کی گولائیوں پر ذراسی لاپرواہی سے لپٹا، کھسکا ہُوا.......

کہیں جیڈ، پالش کیا ہُوا، اور پالش کی انتظار میں پڑا ۔ بڑی، چکنی، سبز جیڈ کی سلیں، کھیتوں جتنی بڑی ۔

کہیں ہریالی کی سمندری لہریں، اُونچی اُٹھتی ہُوئیں لہریں ۔ درختوں کے سروں جتنی بڑی ۔

کہیں پُرانے سمندر کی تہوں میں صدیوں پہلے ڈوبے جہازوں کے مستولوں اور چمنیوں پر لگے زنگ اور کائی کا رنگ، جو گذرے زمانوں کی یاد دلاتا ہے، اور بے حد اُداس ہے ۔

اور کہیں دھرتی کی سبز چھاتی سے نکلتی آگ کی نارنگی لاٹیں ۔ جو برف کے انتظار میں ہیں ۔ جب برف اُن پت جھڑی نارنگی لاٹوں کو اپنے پگھلتے لہو سے بُجھا دے گی، اور آگ کا رنگ سفید ہو جائے گا ۔ اور ننگی پہاڑیاں اپنے سبز اور پت جھڑی لبادے اُتار کے سورج کی گوری دھوپ میں ایڑھیاں اُٹھا کر نہائیں گی . . .

بدلتے موسموں میں زندگی کے چلنے کا، اور سانسوں کے آہستہ آہستہ ختم ہونے اور آخری موت کا احساس بہت شفاف ہو کر اُگلتا ہے ۔ نہیں؟

بیٹھری آرٹ سینٹر میں آج ایک ہسٹرین لیکچر دے رہا تھا۔ باقی تو سب تھیوری کی باتیں تھیں، کہ تاریخی واقعہ ہوتا کیا ہے، اور اس کا تاریخی ماضی کیا ہوتا ہے، اور آئندہ آنے والے واقعات پر اس کا کیا اثر ہوتا ہے۔

لیکن دو باتیں اس نے بڑے پتے کی کیں، جن کے بارے آئندہ کھوج کی جاسکتی ہے۔

پہلی تو یہ، کہ ہندوستان کی تاریخ کا ایک اہم واقعہ تھا، شاہ جہان کے بیٹوں کے اختلاف۔ شاہ جہاں کو دارا شکوہ پسند تھا، کیونکہ وہ اپنے باپ دادا کے اُن اصولوں کا حامی تھا، جن کی وجہ سے ہندو مسلم ایکتا اور بھائی چارہ مغل اصولوں کو پکا اور وسیع کرنے میں کام کرتا رہا۔ اور جن اصولوں کی وجہ سے مغل سلطنت نے پورے ہندوستان کو تقریباً ایک کر دیا۔ ایک اور وسیع۔ لیکن دارا شکوہ کو ہار ہو گئی، اور مغلیہ تخت کو سنبھالا اورنگ زیب نے۔ دارا شکوہ سے پیار کرنے کی سزا اپنے باپ کو بھی دی۔

اور ہندوستان میں شروع ہوئی ایک نئی روایت، جس نے ہندوؤں سے ہندو ہونے کا ٹیکس وصول کرنا شروع کیا، اور جبراً اُن کو مسلمان بنانے کی کوشش شروع ہو گئی۔

یہ وہی مُلک تھا، جہاں ہندوؤں کے من میں مسلمان نظام کی طرف، اور پھر تمام مسلمان قوم کی طرف نفرت کے بیج بوئے گئے۔ نفرت سے پیدا ہونے کی نفرت۔ دو علیحدہ علیحدہ قومیں ہونے کا احساس۔ اور آخر پاکستان کا مطالبہ۔ اور ہندوستان کے دو ٹکڑے ہو گئے۔ قتل و خون!

اگر اورنگ زیب کی جگہ دارا شکوہ شاہ جہان کا جانشین بنتا، تو ہندوستان کی تاریخ شائد اور طرح لکھی جاتی۔ کیونکہ اسی مذہبی نفرت کا فائدہ انگریزوں

نے اُٹھایا، اور ہندوستان کو غلام بنایا۔ اور آخر اس مُلک کے دو، دو بھی نہیں تین مُلک بن گئے۔

دوسری بات تھی، انقلابات کے بارے، کہ آج تک چار بڑے انقلاب ہوئے ہیں۔ کہنے لگے، کہ تاریخ داں تو تین انقلاب مانتے ہیں، لیکن وہ ساتھ چوتھا بھی ملاتا ہے۔ وُہ انقلاب جو مہاتما گاندھی نے ہندوستان میں لایا۔ آہنسا کے ساتھ اور ستیہ گرہ کے ساتھ انقلاب اور مُلک کی آزادی۔ ایک نئی قسم کا انقلاب۔

اور باقی تین انقلاب ہیں ـــــ امریکن انقلاب، فرانسیسی انقلاب، اور رُوسی انقلاب۔ اگر چاہو، تو رُوسی انقلاب کے ساتھ چینی انقلاب بھی جوڑ لیں۔

آج انسان جب پیچھے مُڑ کر دیکھتا ہے، تو صرف فرانسیسی انقلاب ہی اپنی اصلی اور پوُری صوُرت میں کھڑا نظر آتا ہے۔ امریکن انقلاب اپنا مقصد پورا کر کے تاریخ کی ایک چھوٹی سی اکائی بن کے رہ گیا ہے۔ اور رُوسی انقلاب نے فرانسیسی انقلاب کو ہی آئیڈیل کے طور پر استعمال کیا ہے۔

میں اُس کو کہنا چاہتی تھی، کہ جب بھی ہم تاریخ کی بات کرتے ہیں، صرف پولیٹیکل رُخ سے ہی ہم انسان کے ماضی کو کیوں دیکھتے ہیں؟ انسان صرف اور صرف سیاسی اکائی ہے، اور کچھ بھی نہیں؟

تاریخ کی بات کرتے ہوُئے ہم انسان کی کلچرل تاریخ کی بات کیوں نہیں کرتے؟ تاریخ کی کتابوں میں ہم کو، گپتا کا زمانہ، موریہ کا زمانہ، مغل زمانہ، برٹش زمانہ ہی کیوں پڑھایا جاتا ہے؟ کالیداس کا زمانہ، گورو نانک، کبیر، میراں کا زمانہ، امرتا پریتم کا زمانہ کیوں نہیں پڑھایا جاتا؟ انسان کے ماضی کو دیکھنے کا یہ

بھی تو ایک طریقہ ہے نا!

مینہ برس رہا ہے۔

ہندوستان میں کس طرح سب بارش کے موسم کا انتظار کرتے ہیں۔ ساون کے مہینے کے رومانس کے بارے میں بہت سی شاعری کی گئی ہے۔ جیٹھ ہاڑ کی کنڈیالی تھوہر جیسی گرمی کے بعد خشک ہانپتی ہوئی دھرتی بھی پانی مانگتی ہے، فصلیں بھی پانی مانگتی ہیں، انسان بھی اور مویشی بھی۔

اور ساون کے مہینے کی شاعری۔ موری رُن جھُن آیا سے لے کر شو بٹالوی اور امرتا پریتم اور موہن سنگھ کی نظمیں، کالیداس کے 'میگھ دُوت'، اور چرخے اور ترنجن کاتتی مٹیار کے لوک گیت۔

اور ساون کا حسن اور رنگ، اور خوشبو۔ نشہ! اینٹسول!

لیکن یہاں لندن کی جھڑی کی بات ہی کچھ اور ہے۔ نہ یہاں مور ناچتا ہے، نہ چاترک بادلوں کی طرف دیکھ کر بولتا ہے، نہ پینگیں، نہ پیا کے گلے میں باہنیں۔

ایک عجیب اُداسی!

ہوا کا رنگ بے حد مٹیالا، اُداس!

آسمان جیسے ہچکیاں لے کر رو رہا ہو۔ آسمان جیسے چپ چاپ آنسو بہا رہا ہو۔ مکانوں کی ٹائیلوں والی چھتوں پر!

اور گھور اُداسی!

اور شام کے وقت، برستے مینہ میں بجلی کے کھمبے چپ چاپ بھیگتے رہتے رہتے ہیں۔ کھمبوں کے سروں پر زرد بتیاں بڑی بدحواس معلوم ہوتی ہیں، جیسے کسی جوان بیوہ کی ممٹی پر جلتا ہوا دیا!

اور جب شام کو مینہ نہ برستا ہو، اور جلدی جلدی گھر سر آتی شام میں آج کل، اس پت جھڑ کے موسم میں جب گرمی کی رُت ختم ہو چکی ہے، اور سردی بھاگی آرہی ہے، سڑکوں کی بتیاں بڑی ملائم نظر آتی ہیں۔ بڑی شاندار اور بڑی دلفریب بھی۔ مِسٹیکلی ایراٹِک! بہت پُراسرار۔

ریجنٹ سٹریٹ پر چلتے ہوئے، دو لڑکیاں مجھے روک کر کھڑی ہو گئیں۔ ایک کے ہاتھ میں پیسے ڈالنے والی بنچی تھی، ڈبہ سا۔ اور دوسری کے ہاتھ میں چھوٹی چھوٹی جھنڈیاں جن کے ساتھ پن لگے ہوئے تھے۔ جھنڈیوں والی لڑکی میرے کوٹ کے کالر پر جھنڈی لگانے کے لئے آگے بڑھی۔ میں نے کہا کہ پہلے دکھاؤ کہ کیا ہے۔ اس نے جھنڈی دکھائی۔ اُوپر لکھا تھا 'آئی لو لندن'۔ عموماً معذور بچوں کے لیئے، اور اسی طرح اندھوں کے لئے یا لڑائی میں مارے گئے سپاہیوں کی بیواؤں کے لیئے، یا یتیم بچوں کے لیئے، یا لمبی قید بھگت رہے قیدیوں کے لیئے۔ اس لیئے چپ چاپ جھنڈی پکڑ لی جاتی ہے، اور ڈبہ میں حسبِ توفیق چندہ ڈال دیا جاتا ہے۔ لیکن آج پتہ نہیں، کیوں میں جھنڈی لے کر پڑھنے لگی۔

میں نے کہا، لڑکیو! میں نے تمہیں لگانی یہ جھنڈی۔ کیونکہ میں تو لندن کو پیار نہیں کرتی۔ آئی لائک لندن، بٹ آئی لو مائی دِلی اونلی۔

سٹاک ہوم سے میرے دوست کنول کا فون آیا ہے۔ رات کو سپنے میں میں ہردوار گھوم رہا تھا، گنگا کے کنارے، سیڑھیوں پر۔

ویسے وہ سٹاک ہوم میں ایسے عہدے پر ہے، کہ دہلی کے دوست یہی سوچتے ہوں گے، کہ بیٹھا عیش کر رہا ہے، سویڈن میں بیٹھا گلچھرے اُڑا رہا ہے۔ سٹاک ہوم

کے تخت پر بیٹھا بادشاہی کر رہا ہے۔ اور وہ سپنے میں ہر دوار کی سیڑھیوں پر گھوم رہا ہے، اور دہلی کے کافی ہاؤس میں بیٹھ کر دوستوں کے ساتھ گپیں ہانکتا ہے۔

یہ کیا ہے، جو انسان کو اُس کی مٹی کے ساتھ باندھے رکھتا ہے؟

میز کے گرد ہم سب بیٹھے ہیں۔

باتیں کر رہے ہیں۔ اپنے اپنے ملکوں کی۔ اپنے اپنے ملکوں کی تاریخ کی۔

ارپنا بھگت سنگھ کی بات سناتی ہے۔

اینھونی، جو کیمبرج میں پروفیسری کر چکا ہے۔ اور اب ریٹائرڈ ہے، اور اولڈ پیپلز ہوم کی تنہائی سے گھبرا کر یہاں ہمارے لنڈونیا ہاؤس میں آجاتا ہے۔ ارپنا کے ساتھ جھگڑ پڑتا ہے۔ میں نے بہت ہسٹری پڑھی ہے۔ بھگت سنگھ کا کہیں ذکر نہیں۔

ارپنا بھی گرم ہو گئی ہے۔ مجھے کیا پتہ، کہ تم نے کون سی ہسٹری پڑھی ہے۔ ہو گی کسی انگریز کی لکھی ہوئی۔ اگر اس نے ہسٹری کو ڈسٹارٹ، کر کے لکھا ہے، اور تم نے صرف اس کو ہی پڑھا ہے، تو اس میں میں کیا کروں؟ اور کوئی ہسٹری کی کتاب جا کر پڑھو۔

وہ کہتا ہے۔ اوّل تو بھگت سنگھ تھا ہی نہیں۔ ہندؤں نے کئی میتھکل کریکٹر بنائے ہوئے ہیں۔ فرضی۔ بھگت سنگھ بھی ہو گا، کوئی اسی طرح کا فرضی کریکٹر۔ اگر وہ تھا بھی، تو اس نے بم کیوں پھینکا؟ انگریز تو وہاں سے آہی رہے تھے۔

اس طرح کے تعصب سے آپ کیا کر سکتے ہیں؟

یہ تو ایک پروفیسر کا حال ہے۔ عام آدمی کا کیا حال ہو گا، آپ خود اندازہ لگائیں۔

اور آج یہاں انڈیا فیسٹول ہو رہا ہے۔

ہرزاگ کی ڈائریکٹ کی فلم "فٹز گرالڈو" دیکھی۔

ویسے تو 'ہرزاگ' کی ہر فلم زمین سے تھوڑا سا اُوپر ہی چلتی ہے۔ لیکن یہ فلم کمال تھی۔

'فٹز گرالڈو' کو 'اوپیرا' سے عشق تھا۔ سارا دن اپنے بھونپو والے گراموفون پر کبھی نہ کبھی اوپیرا کا ریکارڈ لگائے رکھتا۔ اکیلا تھا، اس لئے محلّے کے سارے بچوں کو اکٹھا کر کے وہ سنگیت سُنواتا۔ سارے محلّے کے بچّے اور ایک سُور۔

دکھنی امریکہ کے انڈین بچّے۔ ہندوستانی نہیں، انڈین۔

'سولی' اس کو عشق کرتی تھی۔ سولی جو ایک کوٹھا چلاتی تھی، جس میں اس نے بیس پچیس لڑکیاں رکھی ہوئی تھیں۔

فٹز گرالڈو کا صرف ایک ہی سپنا تھا، کہ اس جنگلی علاقے میں وہ ایک خوبصورت 'اوپیرا ہاؤس' بنوائے۔ جہاں روزانہ اوپیرا ہو، سنگیت کے سُر گونجیں۔ اور دُور دُور سے اٹلی سے، جرمنی سے سنگیت کار وہاں آ کر گائیں۔

لیکن اوپیرا کے لئے بہت سارے پیسوں کی ضرورت تھی۔

اس لئے پیسے بنانے کے لئے اس نے برف کا کارخانہ لگایا۔

لیکن برف سے کیا بننا تھا؟

آخر سولی کے مشورے سے اس نے بھی باقی باہر سے آ کر بسے ہوئے لوگوں کی طرح ربڑ بنانے کا دھندہ شروع کرنے کا فیصلہ کیا۔

جنگل، میلوں تک پھیلے ہوئے جنگل، ویران پڑے تھے۔ سرکار کہتی تھی، جس کی مرضی ہو، ان جنگلات کو آباد کرے، جتنی مرضی ہے، زمین لے لو۔ لیکن قبضہ لینے کے نو ماہ کے اندر اندر، یا تو ان جنگلوں میں سے ربڑ بنانے کا کام شروع ہو جانا چاہیئے اور یا کاشتکاری شروع ہو جانی چاہیئے۔

اور پھر اس پیسوں کے قابو آئے ہوئے بندے نے کس طرح دین و دنیا کو بھلا

کر یہ کام شروع کیا، کس طرح جہاز خریدنے کے لیے سولی نے اپنی زندگی بھر کی کمائی اس کے حوالے کر دی، اور کس طرح اس نے جنگل صاف کیے، خونخوار دریا پار کیے، وہ جستجو کمال تھی۔ جنون نے بھری جستجو۔

کسی بھی عشق کے لیے جنون تو بہت ضروری ہے۔

لیکن آخر اُس کو جہاز فروخت کرنا پڑا۔ پیرو ترک کرنا پڑا۔

آخری دن جہاز کے سارے پیسوں سے اس نے اٹلی سے پورا آرکسٹرا منگوایا۔ ساری کی ساری اوپرا کمپنی، اپنے لیے ایک بڑھیا کالا کوٹ، اور بڑھیا سگار۔

بکے ہوئے جہاز کی چھت پر آرکسٹرا بج رہا تھا، اوپرا کے ایکٹر گا رہے تھے، اور فٹز گارلڈو کالا کوٹ پہن کر سگار پیتا ہوا اپنے آپ کو دنیا کا بادشاہ محسوس کر رہا تھا۔


ڈارلنگ، ڈنر کیسا لگا؟

"سلمان رُشدی، جس کے آٹو بائیوگرافیکل ناول "مڈ نائیٹ چلڈرن" کو گزشتہ سال یہاں بڑا اساہتیہ انعام ملا تھا، اپنی موٹی خمار آلود آنکھوں میں سنجیدگی اور شرارت کے ملے جلے رنگ ابھار کر کہتا ہے "جب یہاں مارچ میں مسز گاندھی آئی، یہاں پر فیسٹیول آف انڈیا کو شروع کرنے کے لئے، تو مجھے مسز مارگریٹ تھیچر کی سیکرٹری نے فون کیا "مسز تھیچر، مسز گاندھی کو لنچ دے رہی ہے، اور ہم تم کو بھی اس لنچ میں شمولیت کے لئے دعوت نامہ بھیج رہے ہیں"

"مجھے دعوت نامہ؟ آر یو شیور؟"

"ہاں، ہاں، کیوں نہیں؟ تم ہندوستان کے متوطن، اتنے بڑے مصنف، اور انعام یافتہ۔ مسز گاندھی تمہیں مل کر ضرور خوش ہو گی"

پہلے تو سوچا کہ خاموش رہوں۔ پھر سوچا، بے چاری کا لنچ کیوں خراب کرنا ہے۔ اس لئے میں نے مسز تھیچر کی سیکرٹری کو کہا "آئی ڈونٹ تھنک سو۔ کیونکہ اس کتاب میں تو میں نے اندرا گاندھی کو بہت کھری کھری سنائی ہیں"

وہ گھبرا گئی۔

میں نے اس سے پوچھا "تم نے میری وہ کتاب پڑھی ہے؟ مڈ نائیٹ چلڈرن!"

کہنے لگی "سوری، میں نے تو نہیں پڑھی۔ لیکن مجھے ہوم سیکرٹری نے تمہارے نام

کا مشورہ دیا تھا۔

'اب پھر؟' میں نے پوچھا۔

وہ گھبرائی ہوئی تھی۔ کہنے لگی 'اچھا، میں ایک دفعہ پھر مشورہ کر کے فون کروں گی'۔

پھر فون نہ آنا تھا، نہ آیا۔

'دوسرے تیسرے دن کسی انڈین ایسوسی ایشن نے مسز گاندھی اور مسز تھیچر کو ڈنر دیا ہوا تھا، اور فیسٹول کے آرگنائیزرز کو بھی۔ مجھے انہوں نے اس ڈنر میں شامل ہونے کے لئے بہت اصرار کیا، اس لئے میں چلا گیا'۔

'مسز تھیچر جب بولنے لگی، تو یہاں انگلینڈ میں رہتے ہوئے ہندوستانیوں کے بارے میں بتانے لگی، کہ فلاں نے یہاں پر سٹیل کے کارخانے لگائے ہیں، فلاں نے کاروبار بڑھایا ہے۔ اور یہ بیٹھا ہے، سامنے سلمان رُشدی۔ یہ پرسوں پرائز پر آیا تھا۔ اس نے کتاب لکھی ہے، ہندوستان کے بارے، مڈنائیٹ چلڈرن۔ جس کو ابھی لٹریری ایوارڈ ملا ہے۔

اور وہ ہنستا ہے۔

لطیفے پر آس پاس بیٹھے لوگ بھی ہنستے ہیں۔

میرے منہ کا ذائقہ کڑوا ہو جاتا ہے۔

اور میرے من سے شک کا ایک سنپولیا سر اٹھاتا ہے۔ کل نراد چودھری تھا، آج یہ رُشدی! کہیں اس کا ہی تو جانشین نہیں؟ کہیں یہ ایوارڈ اسے اسی بات کا انعام تو نہیں ملا؟ ہندوستان کا مذاق اُڑانے کے لئے! اور یہ کہنے کی جرأت کر لی، کہ انڈیا میں کالا پیسہ اور کالا دھندہ تو برابر کا ہی رہے گا، کیونکہ مسز گاندھی چاہے جتنی بھی چالاک ہو۔ چاہے کتنی بھی اس کی دوغلی پالیسیاں ہوں، لیکن اس کالے پیسے، اور گورے پیسے کے بارے تو وہ اعلانیہ اقبال کرتی ہے۔ آپ نے دیکھا نہیں؟ اپنا

سر آدھا دُرہ کالا رنگتی ہے، اور آدھا حصّہ سفید رکھتی ہے۔"
اور اس طرح کی کئی باتیں۔
سوچا تھا، کہ رُشدی کا انٹرویو لوں گی، ہندوستان ٹائمز کے لئے، اور ناگ منی کے لئے، اور علی گڑھ کے ہندی اخبار کے لئے، جس کی میں سپیشل کارسپانڈنٹ ہوں۔ لیکن رُشدی کے لطیفے سُن، اور اس کا گھور غرور دیکھ کر مَن کھٹا ہو گیا۔

سورن چندن کو بھی میں نے ان چند مہینوں میں ہی ڈسکور کیا ہے۔ کوملیس کی طرح اس کی تحریر میں بھی پختگی ہے۔ لیکن اس کی سب کہانیوں میں سے "کچے گھر" سب سے خوبصورت ہے۔ اس میں کچے گھروں کی اپنی منفرد خوشبو ہے۔
یہاں کی مصروف زندگی میں گھرے ہونے کے باوجود، جو بھی کوئی ایمانداری سے لگاتار لکھتا ہے، اور باقاعدہ دُنیا کے ادب کا مطالعہ کرتا ہے، اُس کو میں سلام کرتی ہوں، یعنی سورن چندن کو۔
اس کا خوبصورت گھر کتابوں سے بھرا ہوا ہے۔ بلاناغہ اور لگاتار لکھنے کی وجہ سے نہ صرف اس کی چار پانچ کتابیں چھپ چکی ہیں، بلکہ اس کے پاس تین ناول لٹے سنوار کر لکھے ہوئے، اور فائنل مسودے تیار کیے ہوئے پڑے ہیں۔
پبلشر کا انتظار کر رہے ہیں۔

ترسیم نیلگری کو میں فون پر اس کی ماہنامہ آرسی میں چھپی کہانی کی مبارک دیتی ہوں۔ "بھئی آج تک تم نے جو کچھ بھی لکھا ہے، میں سب پڑھتی رہی ہوں، مگر یہ کہانی اُن سب سے بڑھیا تھی، بہترین۔ اس لئے پہلی دفعہ تم کو مبارک دے رہی ہوں"

دُوسری طرف سے آواز جیسے ہمالیہ کی کسی چوٹی سے آتی ہے، 'ہاں، ہیلو بھی۔'

'تم آؤ نا! آج کل دار پنا، (میری بیٹی) کی پینٹنگز کی ایگزیبیشن اکتوبر گیلری میں لگی ہوئی ہے۔ ہم وہیں رہ رہے ہیں۔ آجا۔ ایگزیبیشن بھی دیکھنا، اور ساتھ گپیں بھی ماریں گے۔'

'وہ تو میں نے دیکھی ہوئی ہے۔' اس کی آواز وہیں ہے، ہمالیہ پر۔

'دیکھی ہے تم نے؟ کب؟ کب چپ چاپ آ کر دیکھ گئے؟ ملے بھی نہیں! میں حیران ہوں۔

'پچھلے سال دیکھی تھی، انڈیا ہاؤس میں۔'

یہ واقعہ بہت کم رونما ہوتا ہے، جب مجھے کوئی جواب نہ سوجھے۔

جس طرح کوئی مجھے کہے وہاں میں نے تمہیں پڑھا ہوا ہے۔ 'خانہ بدوش'؟ وہ نہیں پڑھی۔ 'ساویاں چیڑیاں'؟ 'وہ بھی نہیں۔' 'فالتو عورت'؟ 'نہیں بھئی، میں نے پڑھی تھی 'دگل بانو'۔' اس کو میں کیا جواب دوں گی؟

ٹیٹ گیلری میں ٹنگوئیلی کے 'سکلپ چرز' کی نمائش لگی ہوئی ہے۔

ٹنگوئیلی کا پہلا سکلپ چر جو میں نے پہلی بار دیکھا تھا، وہ سوئٹزرلینڈ کے شہر ابیسل کے باہر لگا ہوا تھا۔ ایک درمیانے سے تالاب کے درمیان یہ سکلپ چر تھا، ایک بڑا پہیہ سا، جس کے چاروں طرف بازوؤں کی طرح نکلی ہوئی چھلنیاں اور کنوؤں کی ٹنڈیں اور بڑی کڑچھیاں سی تھیں۔ پہلی آہستہ آہستہ گھومتی تھیں۔ اور یہ چھلنیاں اور ٹنڈیں اور کڑچھیاں نیچے سے پانی بھرتی تھیں، اور پھر آہستہ آہستہ اُوپر آ کر پانی گراتی جاتی تھیں۔ چھلنی میں سے چھنتا پانی! کڑچھیوں میں سے گرتا پانی! ٹنڈوں میں سے اُلٹے منہ گرتا پانی۔

یہ سکلپ چر اتنا خوبصورت تھا، کہ ہمارے ٹرپ کے باقی لوگ اندر چلے گئے، تھیٹر کی بلڈنگ، بینڈ اور دوسری چیزیں دیکھنے۔ میں اور اریناسارادن تالاب کے کنارے بیٹھیں ٹنگوٹلی کے اس عجیب سکلپ چر کو دیکھتی رہیں۔

اور اب تین سال کے بعد ٹنگوٹیلی کے اتنے سارے عجیب وغریب سکلپ چرز کا ٹیٹ گیلری میں میلہ۔ دیکھ دیکھ کر طبیعت سیر ہی نہیں ہوتی۔

جس دن دھوپ نکل آئے، اور خاص کر وہ دن سنیچروار ہو یعنی ویک اینڈ، تو رنگوں کا میلہ لگ جاتا ہے۔ گوری چکیلی، نکھری ہوئی دھوپ کا، انتہا کا حسن۔ دھوپ کا سنہری اور چمبیلی نما رنگ، آسمان کا ہلکا نیلا رنگ۔ ریجنٹ پارک اور سینٹ جیمز پارک اور ہائیڈ پارک کی جھیلوں کے کنارے اور درختوں کے جھرمٹوں کے درمیان جمع بھیڑ، اور سبز گھاس کے اوپر پھیلی بھیڑ، سبز گھاس جو پت جھڑ کے آغاز سے پہلے، جو شوخ سبز ہوا کرتا تھا، چمکتی مخمل کا قالین اس میں اب ذرا ذرا مٹیالی جھلک نظر آنے لگی ہے۔ لوگوں کی بھیڑ میں سے جھانکتے رنگوں کے میلے! سرخ بلاؤز، نیلی واسکٹیں، کرمچی سویٹر، کالی اور نیلی پتلونیں، گندم کی پکی بالیوں کے رنگ جیسے بال۔ چمکتی دھوپ کی آغوش میں ستاتے سمندر کی نیلاہٹ، اور سبزہ زار ہریالی، بھیگی ہوئی، نیلاہٹ، سِل اور ہریالی آنکھوں میں اتری ہوئی، بادلوں کا رنگ کہیں کہیں بالوں میں اٹکا ہوا۔ بادلوں کا دھوکہ دیتی ہوئی زلفیں، پت جھڑی رنگ کی زلفیں آوارہ اڑتی ہوئیں۔ کاسنی اور گلابی فراک، سکرٹیں اور بلاؤز۔ تتلیوں کی طرح اڑتے ہوئے رنگ پارکوں میں ٹہلتے، اور سڑکوں پر چلتے رنگ۔ رنگوں کے ہجوم۔ رنگوں کی محفلیں۔

لیکن اگر جرمنی اور فرانس کی لڑکیوں سے مقابلے پر دیکھیں، تو انگلینڈ کی لڑکیاں بے چاری پرووِنشل، معلوم ہوتی ہیں۔ جرمنی اور فرانس کی لڑکیاں بڑے ٹھسکا کر پڑے

پہنتی ہیں۔ دوکانیں بھی زیادہ تر "فیشن ڈیزائیزز" کے کپڑوں کی ہوتی ہیں۔ ہر کپڑا علیحدہ علیحدہ رنگوں کا، علیحدہ علیحدہ بناوٹ کا، علیحدہ علیحدہ کٹ اور فیشن کا۔ انگلینڈ کی طرح نہیں، جہاں سیکریٹریٹ میں کام کرنے والی لڑکیوں کے پان جیسے، سیدھے سادے، ایک جیسے، ہزاروں لاکھوں کی تعداد میں ایک ہی طرح کے سِلے ہوئے کپڑے ڈھیروں کے حساب سے ملتے ہیں، ہر سٹور میں۔ اور لڑکیاں بیچاری وہی خرید خرید کر پہنتی رہتی ہے۔

دِن چھوٹے ہو رہے ہیں۔ دِنوں میں روشنی اور چانن کم ہو رہا ہے۔

آسمان کسی دیہاتی بیوہ کے کپڑوں کی طرح میلا، اور گھسیلا ہو گیا ہے۔

دُھوپ میں سے بھی چمکتی سفیدی اور شوخی غائب ہو گئی ہے۔ دھوپ اگر کبھی کہیں اتفاقاً نکل بھی آئے، تو بڑی بے چاری سی معلوم ہوتی ہے۔

بادل ہمارے ہندوستان کے بادلوں کی طرح نہیں، کہ آئیں تو نظر آئیں۔ انسانوں کو ہی نہیں، بلکہ موروں کو، پپیہوں کو، چڑیوں کو اور سارے چرند پرند کو نظر آئیں۔ اور تو اور سمندر کے بالکل نیچے پڑی سیپیوں کو بھی نظر آجائیں، اور وہ کسی بوند کے لئے منہ کھول کر انتظار میں بیٹھ جائیں۔ اپنے ملک کے بادلوں میں ذرا دم خم ہوتا ہے، آواز کی کڑک ہوتی ہے۔ بوڑھے بابے کی طرح کھونڈا کھٹکھٹاتے، اور کھنکھارتے ہوئے آتے ہیں۔

لیکن یہاں کے بادل بڑے بے دم ہیں۔ بیگار میں پکڑے ہوئے ہل چلانے والوں کی طرح۔

بس، جیسے آسمان پُورے کا پورا نیچے جھک آتا ہے۔ میلا، پرانے لحاف کی طرح کا آسمان۔

آج کل یہاں پھولوں کو سردیوں کے لیئے سنوارا جا رہا ہے۔ اخباروں میں اس کے بارے جانکاری شایع ہوتی ہے، ریڈیو پر ترکیبیں بتائی جاتی ہیں، ٹیلیویژن پر پروگرام ہو رہے ہیں، کہ سردیوں کی کہر آلود ٹھنڈ میں اور برفوں کے موسم میں گلاب کو اور دوسرے پودوں کی کیس طرح پرورش کرنی چاہیئے۔

پھولوں کے پودے سو جائیں گے۔ بطخیں اور ٹرنز اور دوسری چڑیاں گرم علاقوں کی طرف اُڑ جائیں گی۔ اور تھ اور مچھلیاں بھی لہروں کی کیکل میں لپٹ کر دھوپ والے علاقوں کے خنک سمندروں کی طرف چلی جائیں گی۔ سب کچھ برف کے نیچے سو جائے گا۔ سبز گھاس بھی، بھوری زمین بھی۔

راتیں لمبی ہو جائیں گی، میلوں لمبی۔

دُھوپ کے لئے لوگ ترسیں گے۔ اور دُھوپ کے موسم کے انتظار میں سینٹرل ہیٹنگ کے ذریعے گرم کیئے گئے گھروں میں بیٹھے رہیں گے، گرمیوں کے انتظار میں۔

اُن دنوں میں دہلی کی سڑکوں پر گھوم رہی ہوں گی۔ نیم گرم دُھوپ میں بیٹھ کر پڑھ رہی ہوں گی، گاجریں کھا رہی ہوں گی، دانے چبا رہی ہوں گی، انڈیا انٹرنیشنل سینٹر کے کافی لاونج میں کافی پی رہی ہوں گی، فلمیں اور ڈرامے دیکھ رہی ہوں گی، سنگیت کی محفلوں میں الاپچی کھا رہی ہوں گی، اور سنگیت سُن رہی ہوں گی۔

اور آپ سب کو یاد کر رہی ہوں گی۔ اگلے برس کی بسنتی ہوائیں جب چلیں گی، برف کے نیچے سوئے ہوئے گھاس کی تیلیاں جب جاگیں گی، گلاب کا موسم جب آئے گا، اس وقت ٹرنز کی طرح اور مرغابیوں کی طرح شاید پھر آپ کے دیس میں آ جاؤں۔ ورنہ، کل کا کیا پتہ ہوتا ہے۔

پتہ، تو اگلے پل کا بھی نہیں ہوتا، دوستو!۔


BELL
PUB
ٹی وی پر تیس چینل
بھی ہو جائیں، پھر بھی
یہی کہو گے، کہ ٹی وی پر کچھ
نہیں ہے، سب بکواس ہے۔
Sharma

اِنٹرویو

اجیت کور (۱۶ نومبر ۱۹۳۴ء) ایک پیدائشی جپسی

امرتا پریتم :۔ میرا خیال ہے ۔ تمہارے پاس چوری کی پوٹلی کوئی نہیں. کئی مصنفوں یا مصوروں کے ساتھ بات کرتے ہوئے مجھے محسوس ہوتا ہے، جیسے اُن کی محبت یا اُن کی شادی کوئی چوری کی پوٹلی ہو، جس کی بات کرنے سے وہ کتراتے ہوں.....

اجیت :۔ بھئی، اپنے پاس تو چوری کی پوٹلی کوئی نہیں۔ لیکن اپنی زندگی کی ٹریجڈی یہ رہی ہے، کہ جتنے بھی بندے ملے، وہ رشتوں کو چوری کی پوٹلیاں بنا کر بغل میں دبائے پھرتے تھے۔ اور اگر کبھی اُن کی کوئی پوٹلی کھلوالی، تو وہ اُسی کو جھنگل ماٹا بنا کر اس میں چھپ کر بیٹھنا چاہتے تھے۔ اور اپنا مجھو تہ کبھی جھنگل ماٹوں سے نہیں ہوا.....

امرتا :۔ عورتیں تو برقعہ پوش ہوتی ہیں، لیکن مرد جھنگل ماٹا پوش نئی ٹرم ہے.....

اجیت :۔ جھنگل ماٹے میں چھپ کر، ایک کونے میں بیٹھا تو جا سکتا

ہے، لیکن نہ زمین پر ورٹیکل اور نہ سپیس میں ہوریزینٹلی چلا جا سکتا ہے۔ اور یہ جو دو قسموں کا چلنا ہے، اس کے بغیر کِس طرح زندگی گزاری جاتی ہے، اس کا مجھے طریقہ نہیں آتا..... اسی لئے وہ اپنے کونوں میں بیٹھے رہے، اور میں چلتی رہی...

امرتا :۔ وہ کونوں میں سے کبھی چلتی کو آواز تو دیتے ہوں گے؟

اجیت :۔ نہیں۔ بلکہ کونوں میں بیٹھنے والے کو غصہ آتا ہے، کہ یہ عجیب بدتمیز عورت ہے۔ کیونکہ کونوں میں بیٹھنا عورت کا دھرم ہوتا ہے، اور چلنا مرد کا حق ہوتا ہے۔ اور آواز دینے کے تصوّر کے ساتھ انتظار کا تصوّر جڑا ہوتا ہے، جو انتظار کرے گا، وہی آواز دے گا نا، مگر انتظار کرنا بھی عورت کا دھرم ہوتا ہے..

امرتا :۔ تو اجیت، تم نے دھرم اور حق دونوں لفظوں کی تقدیر بدل دی..

اجیت :۔ شاید! لیکن اس کا نتیجہ ٹوٹل تنہائی.....

امرتا :۔ تم جیسی عورت کونے میں بیٹھتی، تو بھی صرف تنہائی بھگتتی۔ لیکن کیا یہ اچھا نہیں، کہ تم نے ساری تنہائی چل کر بھگتی، بیٹھ کر نہیں؟

اجیت :۔ ہاں، جب کبھی مڑ کر دیکھتی ہوں، کہ کِس مقام پر غلطی ہوئی، تو اس طرح کا مقام کہیں نظر نہیں آتا.....

امرتا :۔ تمہاری قلم کِس عمر میں تمہارے ساتھ چلنے لگی؟

اجیت :۔ اس وقت میں سولہ ساڑھے سولہ سال کی ہوں گی۔ بلدیو، جن کو پیار کیا، ہم کو کلاس میں انگریزی پڑھاتے تھے۔ میں دل کی بات بتا نہیں سکتی تھی اور وہ سنجیدہ ہو کر سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے تھے۔ سمجھتے تھے ــــ میں بچّی ہوں....

امرتا :۔ تو عمر سے زیادہ سیانا ہونا، تمہارا پہلا قصور تھا؟

اجیت :۔ ہاں، گناہِ اوّل۔

امرتا :۔ پھر سولہ سال کی عمر میں جو کہانی لکھی، اُنہوں نے پڑھی؟

اجیت :- پڑھی نہیں، پہلی بار سُنی۔ کیونکہ پہلی بار نہ میرے پاس ہمّت تھی، کہ پڑھنے کے لیے دیتی، اور نہ میرے پاس ہمّت تھی، کہ کہیں شائع ہونے کے لیے بھیجتی۔ لیکن پنجابی کا کوئی فنکشن تھا، اب مجھے یاد نہیں رہا، کہ کیا کیا فنکشن تھا۔ وہاں میں نے کہانی پڑھی، کئی ایک نے نظمیں پڑھیں تھیں، گیت پڑھے تھے۔ میں نے کہانی پڑھی۔ سُننے والوں میں ایک کوئی پروفیسر رام سنگھ بھی بیٹھے ہوئے تھے، انہوں نے اپنے پرچے کے لیئے مجھ سے لے لی تھی۔ اور جو کچھ صرف ایک بندے کے لیئے لکھا تھا، وُہ چھپا، نشر ہوُا، تعریف ہوئی، اور میں کہانیاں لکھنے لگی....

امرتا :- کمبخت کافکا کا اپنے باپ کو لکھا ہوُا ایک خط ملتا ہے، کہ میں آپ کے گلے لگ کر رونا چاہتا تھا، مگر رو نہ سکا تھا، اس لیئے اب ساہت کے گلے لگ کر روتا ہوُں۔ تو کیا اجیت تم نے کافکا والی تقدیر پائی....

اجیت :- زیادہ تر لکھنے والوں کی یہی تقدیر ہوتی ہے...

امرتا :- سوچوں کے جن ٹکڑوں نے جُڑ کر تقدیر کی یہ لکیر بنائی، کوئی اُن کی بات سُنائیے!

اجیت :- سوچا جائے، تو مکمل جینا، اور اندر باہر سے ایک جیسا جینا، یہ جینے کا سب سے زیادہ آسان طریقہ ہونا چاہیئے۔ کیونکہ یہ سب سے زیادہ لاجیکل ہے۔ لیکن اس بات کی سمجھ نہیں آئی، کہ یہ طریقہ سب سے زیادہ مشکل کیوں ہے؟ جو طریقہ باقی ساری کائنات کے زندگی کے عمل میں کوئی رکاوٹ نہیں ڈالتا —— دُھوپ بکھر کر زندہ رہ سکتی ہے، پھُول درخت آسمان کی طرف بڑھ کر زندہ رہ سکتے ہیں، آسانی اور سہوُلت سے۔ لیکن اسی طریقے سے جب انسان جینا چاہتا ہے، اس کا نتیجہ عموماً ٹریجڈی اور اکیلا پن کیوں ہوتا ہے؟

امرتا :- کیونکہ انسان کی کائنات کرنوں کھدروں کی کائنات ہے۔ ابھی

تو تم نے خود کونسی کی بات کی تھی.... انسان نے ابھی ہوا، پانی، اور درخت پودوں کی قسمت نہیں پائی۔ اس لیئے اجیت! زندگی کے حادثے جُوں جُوں زندگی کو توڑتے گئے، سوچوں کے ٹکڑے جُڑتے گئے۔ کون سی کتابوں نے کچھ مدد کی تھی ___ سوچوں کو جوڑنے میں؟

اجیت: ۔ شروع شروع میں تو ٹیگور کی 'ہنگری سٹون'، جیسی کہانیاں پڑھ کر دیوار کے ساتھ لگ کر رونے کو دل کرتا تھا۔ یا ہارڈی کی 'ٹیس' پڑھ کر، یا ہیگو کا 'لامزریبل'، پڑھ کر محسوس ہوتا تھا، کہ زندگی کا جز پورا حاصل ہے، وہ درد ہے ___ ذہنی اذیت....

امرتا: ۔ اور اس بات کی تصدیق شادی والے حادثے نے کر دی؟

اجیت: ۔ تصدیق سے بھی زیادہ۔ لیکن پھر بھی اندر کچھ تھا، جو کہتا تھا کہ یہ غلط ہے۔ یہ سارے نظام میں کوئی سخت گڑبڑ ہے۔ یہ کس طرح ہو سکتا ہے، کہ آسمان کے اتنے خوبصورت نیلے رنگ کے نیچے، گوری دُھوپ اور تاروں بھری راتوں کے پھیلاؤ کے نیچے، خوبصورت پھولوں اور درختوں میں گھری اس دھرتی پر انسان صرف اسی لیئے چلتے پھرتے ہوں، کہ انہوں نے ایک اذیّت کو بھگتنا ہے۔ چاہے یہ بات آس پاس کے بڑے بوڑھے سکھاتے تھے، یہی بات مذہب سکھاتا تھا، لیکن ماتھے کی سوچ یہ بات مانتی نہیں تھی۔ اس لیئے جن سالوں میں زندگی کا حُسن استعمال کرنا چاہیئے تھا، سوچ کی اس بھٹکن میں بیت گئے....

امرتا: ۔ زندگی شاید اسی ضدّی سوچ کا نام ہوتا ہے...

اجیت: ۔ ضدّی سوچ کا عالم تو یہ رہا امرتا جی! کہ گھر میں بڑا مذہبی ماحول تھا، اس لیئے رب نام کی چیز کا آس پاس کی ہوا میں تیرتے رہنا لازمی تھا۔ اور جو چیز آپ کے آس پاس کی ہوا میں ہو، آپ کا کبھی کبھار اس سے مخاطب ہونا لازمی ہوتا

ہے۔ لیکن میں جب بھی اس سے مخاطب ہوئی، یا تو نہایت غصے کی چیخ جیسی "کیوں"
کے ساتھ، اور اگر کبھی غصہ کا تیور ذرا ڈھیلا ہوا، تو "یا الٰہی، یہ ماجرا کیا ہے" کی طرح۔

امرتا:۔ اجیت! یہ تیرے آثار گھر میں کسی نے پہچانے تھے؟

اجیت:۔ لگتا ہے، بے جی اور دار جی دونوں نے پہچانے ہوں گے۔ اسی لئے سوچا ہوگا، کہ اس کی فوراً شادی کر دینی چاہیئے۔ لڑکی کافی منہ زور ہے۔

امرتا:۔ لیکن اس سے تو یہ آثار اور بھی سان پر چڑھنے تھے۔ انہوں نے یہ نہیں سوچا تھا؟

اجیت:۔ ہماری آپ کی جنریشن تک کوئی لڑکیوں کے بارے سیریئسلی سوچتا تھا؟

امرتا:۔ سوچتے تھے، لیکن ہر مرض کی دوا شادی کی شکل میں۔

اجیت:۔ سچ ہے۔ ہوش سنبھالنے سے لے کر سب سے سیریس بات جو لڑکی کے کانوں میں پڑتی تھی، وہ یہی ہوتی تھی، کہ تم نے پرائے گھر جانا ہے...

امرتا:۔ کونوں کی سائیکالوجی کی بنیاد ضرور یہاں سے ہوئی ہوگی — جب لڑکی کو اپنے گھر جانے کی بجائے پرائے گھر جانے کی سوچ دی ہوگی....

اجیت:۔ آپ نے بالکل سچ کہا ہے۔ اور میں یہ بھی سوچتی ہوں — اس لڑکی کے بچپن کا، الڑھپن کا، چڑھتی جوانی کا باقی کیا رہ جاتا ہوگا، جس کے گلے میں چکی کے پاٹ جیسا یہ احساس تعویذ کی طرح لٹکا دیا جائے، کہ جس گھر میں وہ اس وقت ہے، وہ تو اس کا ہے ہی نہیں، اور جہاں اس نے جانا ہے، وہ گھر پرایا ہونا ہے...

امرتا:۔ تو عورت اصل معنوں میں دھرتی کی جیسی نسل ہے....

اجیت:۔ ہاں! پیدائشی بے گھر....

امرتا:۔ لیکن تمہاری قلم نے جن لوگوں کے من میں گھر کیا ہوا ہے، ان کے

لئے ایک عورت، میرا مطلب ہے، تم ایک بڑی قیمتی چیز ہو۔ کبھی تمہیں غرور سا ہوا ہے، کہ نہیں؟

اجیت :۔ نہیں۔ ابھی میں شائد اس سٹیج پر نہیں پہنچی۔ اچھا لگتا ہے، جب کوئی تعریف کرتا ہے، اور جب کوئی اس طرح کا بندہ تعریف کرتا ہے، جس کے لئے میرے من میں بڑی جگہ ہو، جیسے آپ۔ تو میرا من جیسے بارش میں بھیگ جاتا ہے۔

امرتا :۔ لیکن کون سی دھوپیں، کس حد تک برداشت کیں؟

اجیت :۔ بڑی عجیب بات ہے، کہ کئی دفعہ بڑی تیکھی اور کئی دفعہ بڑی بے ہودہ تنقید بھی ہوئی، مگر ہمیشہ یہ بات، کہ یہ تنقید کرنے والے لوگ میرے نوٹس کے قابل نہیں....

امرتا :۔ تمہاری کون سی کہانی پر اس طرح کی تنقید ہوئی تھی؟

اجیت :۔ بہت پہلے۔ شائد اٹھائیس برس پہلے، کہانی تھی 'چھنکنیاں والی' اس پر ہوئی تھی۔ اور پھر اس کے بعد لگاتار کئی کہانیوں پر۔ اور زیادہ مار جن کہانیوں پر پڑی، وہ تھیں — 'پنج روپے والا اکم'، 'کھوپے کی ٹوکٹی'، اور یاد نہیں.... لیکن مار صرف کہانیوں پر نہیں پڑتی، وہ تو اس بات پر پڑتی ہے، کہ یہ عورت ہے، اکیلی رہتی ہے، اور اپنے طریقے سے جیتی ہے۔ تنقید کہانیوں پر ہو، وہ تو پھر بھی فیئر گیم ہوئی، لیکن یہ تو سراسر روند مارنے والی بات ہوتی ہے۔ اور ان روند مارنے والوں کا مجھ سے زیادہ آپ کو تجربہ ہے....

امرتا :۔ میں تو اُن کی بات سُننے کے لئے اب کانوں سے بہری ہو گئی ہوں...

اجیت :۔ آپ اب ہوئے ہیں، بہت پہلے ہو جانا چاہیئے تھا....

امرتا :۔ شکر کرو، بہری ہوئی ہوں، گونگی نہیں ہوئی....

اجیت :۔ نہیں، نہیں، گونگا اُن کو ہونا چاہیئے، جن کو بات کرنے کا شعور

نہیں۔ جو عبادت والی جگہ پر کھڑے ہو کر گالیاں نکال سکتے ہیں....

امرتا:۔ اجیت! رات کو میں مینڈیلسٹام کی بائیوگرافی پڑھ رہی تھی، اس کی بیوی کی لکھی ہوئی۔ وہ شاعر جب جلاوطن کیا گیا تھا، اس کی تمام تحریریں پڑھنا بھی منع تھا، اور ان کا سُننا بھی۔ اس کی بیوی نے سِلے ہوئے ہونٹوں سے اس کی نظمیں کنٹھ کر لی تھیں۔ ہونٹوں سے پرے نیچے گلے میں رکھ لی تھیں.... دُنیا میں نہ معلوم کتنے لوگ گُونگے کر دیئے جاتے ہیں....

اجیت:۔ جس کو اس طرح گونگا جائے، اس کی سوچ بلکہ سان پر چڑھ کر تیکھی ہو جاتی ہے، اور اس میں سے بغاوت پیدا ہوتی ہے۔ اسی طرح میرے خاوند نے مجھے گونگا کر دیا تھا۔ کہانی لکھی تھی، تو قارئین کے خط آتے تھے، کبھی کبھار کوئی ملنے بھی آجاتا تھا۔ میرے خاوند نے کہانی لکھنے پر پابندی لگا دی تھی۔ آٹھ سال قلم تو گونگی رہی، لیکن ماتھے کے دور اندر تک آہستہ آہستہ ایک بغاوت سی کھولتی رہی، اور جب بھڑکی، تو میں نے اپنا راستہ اُن سے الگ کر لیا۔ اگر وہ زبردستی میری قلم کو گونگا نہ کرتے، تو میں شائد ساری عمر کمپرومائز میں جیتی رہتی....

امرتا:۔ نہیں، کمپرومائز نے بھی ایک دِن لاوا بن جانا تھا....

اجیت:۔ ہو سکتا ہے.... آج لگتا ہے، کہ کمپرومائز میری طبیعت میں ہی نہیں۔ واقعی کمپرومائز اور جرأت کبھی اکھٹے نہیں رہ سکتے۔ شائد اسی لئے اکیلی ہوں ۔۔ جرأت کی طرح اکیلی۔

اَل اِنٹرنیشنل فلمی میلہ

فلم فیسٹیول۔

دہلی کے اس فلمی میلے کو دیکھتے ہوئے، اسی شہر میں منعقد ہوئے پہلے فلمی میلے کی یاد آتی ہے۔ کیس طرح ہر سینما ہال کے باہر لوگوں کے ہجوم اُمڈے رہتے تھے۔ پولیس کے بندوبست کے باوجود سر پھٹنے کی نوبت آجایا کرتی تھی۔

لیکن اس دفعہ کا یہ میلہ بڑا پُرسکون چل رہا ہے۔ کسی بھی سینما ہال میں اتنی بھیڑ نہیں، کہ کوئی ارادہ کر کے فلم دیکھنے جائے، اور بغیر دیکھے واپس مُڑ جائے۔

یہ ٹھنڈا ماحول کیوں ؟

شاید اس لئے کہ جب پچھلی دفعہ لوگوں نے ہمیشہ کی طرح قطاروں میں کھڑے ہو کر سیزن ٹکٹ لئے تھے، تو کئی بار اس قسم کی فلمیں دیکھنی پڑیں، جن کو ویسے کمرشل طریقے سے ریلیز ہو کر چلنے کا کوئی امکان نہیں تھا۔ اور ہر شو کے وقت ہر سینما ہال کے باہر یہ سیزن ٹکٹ آدھی قیمت پر خریدنے کو بھی کوئی تیار نہ تھا۔

کیا وجہ ؟

ہندوستان میں ہونے والے اس فلمی میلے میں دُنیا کی بہترین فلمیں نہیں آتیں۔ ایک تو ہندوستان کے فلمی میلے کی اتنی ساکھ نہیں بنی، اور دوسرے یہ کہ بہترین فلموں نے آگے فروری مارچ میں دُنیا کے اور ساکھ والے میلوں میں جانا ہوتا ہے۔ . .

برلن میلے میں، کان میلے میں۔ ان میلوں کو چھوڑ کر ہندوستان کون آنا چاہے گا؟

فلمی دُنیا کے لوگوں کا خیال ہے، کہ یہ جنوری کا مہینہ اس میلے کے لئے غلط ہے۔ پہلے پہل تو چلو جو بھی مہینہ فرانس کی آرگنائزیشن نے، جو دنیا بھر کے فلمی میلوں کا وقت مقرر کرتی ہے، ہندوستان کو دے دیا، وُہی ٹھیک تھا۔ لیکن بعد میں، اب جب کہ اتنے سالوں سے لگاتار یہ انٹرنیشنل فلم فیسٹول، جو ہم کر رہے ہیں، یہ مہینہ بدلوایا کیوں نہیں گیا؟ اس کے بعد، خاص کر کے گذشتہ دس سالوں کے دوران 'فلم فیسٹول ڈائریکٹوریٹ' کے سینکڑوں لوگ سینکڑوں دفعہ فرانس گئے ہوں گے۔ لیکن یہ ضروری کام انہوں نے کیوں نہیں کیا؟ ویسے تو وُہ بھی سچے ہیں، پیرس جیسی رنگین جگہ پر جا کر کام کرنے کو کس کمبخت کا دل کرتا ہے۔

خیر، میلہ یہاں کے 'ایشیاڈ ولیج' کے کلچرل ایڈیٹوریم میں ہو رہا ہے۔ وہاں فلمی دُنیا کے لوگ، پریس والے لوگ اور باہر سے آئے فلمی مہمان، میلہ دیکھ رہے ہیں۔ اور باقی لوگوں کے لیے آٹھ سینماؤں میں یہ فلمیں دِکھائی جا رہی ہیں۔

اس کے علاوہ ہندوستان کے مختلف صُوبوں میں بنی ریجنل فلمیں، ماولنکر ہال میں دکھائی جا رہی ہیں۔ فلم فیسٹول کے دوران ایک یہی وقت ہوتا ہے، جب اپنے ہی مُلک میں مختلف بولیوں میں بنی فلمیں انگریزی کے سب ٹائیٹل، کے ساتھ آپ دیکھ سکتے ہیں۔ ورنہ تو بنگالی، کنڑ، ملیالم، تیلگو میں بنی فلموں سے آپ انجان ہی رہ جاتے ہیں۔

ویسے اگر سوچا جائے، تو یہی حال ساہت کا بھی ہے۔ ہندوستان کی مختلف بولیوں میں جو بھی اچھا لکھا جا رہا ہے، اس کو کہاں کوئی پڑھ سکتا ہے۔ ہم شیکسپیئر، ملٹن، کیٹس اور شیلی کے بارے تو بہت جانتے ہیں، لیکن تیلگو، کنڑ اور ملیالم کے مصنفوں کے بارے کچھ نہیں جانتے۔ صِرف جو تھوڑا بہت جو ترجمہ ہو کر ساہت

اکیڈیمی کے سہ ماہی پرچے 'انڈین لٹریچر' میں چھپ جاتا ہے۔ یہ ہمارا چھوٹا سا جھروکہ ہے۔ جھروکہ بھی نہیں، چھوٹا سا روزن۔ جس میں سے ایک آدھ مصنف کی کوئی کہانی یا نظم پڑھنے کو مل جاتی ہے۔ بس۔

خیر، ماد لنکر میں ہو رہے اس 'انڈین پینوراما' میں ملیالم، اڑیا، بنگالی، تامل، کنڑ کی فلمیں دکھائی جا رہی ہیں۔

فلموں کا ایک حصّہ 'انڈین ریٹرو سپیکٹو' ہے، اور دوسرا 'فارن ریٹرو سپیکٹو' ہے۔ ہندوستانی فلموں میں بھی شانتارام کی، راجکپور کی، بمل رائے کی اور بی۔ این۔ ریڈی کی فلمیں دکھائی جا رہی ہیں۔

شانتارام کی ۱۹۳۰ میں بنی فلم 'دنیا نہ مانے'، ۱۹۳۹ کی فلم 'آدمی'، ۱۹۴۳ کی 'پڑوسی'، ۱۹۴۶ کی 'ڈاکٹر کوٹنس کی امر کہانی'، ۱۹۵۱ میں بنی 'امر بھوپالی'، ۱۹۵۵ کی 'جھنک جھنک پایل باجے'، اور ۱۹۵۷ کی 'دو آنکھیں بارہ ہاتھ'، دکھائی جا رہی ہیں۔

راجکپور کی ۱۹۴۸ میں بنی 'آگ'، ۱۹۴۹ کی 'برسات'، ۱۹۵۱ کی 'آوارہ' ۱۹۵۵ کی 'شری چار سو بیس'، ۱۹۶۰ کی 'جس دیش میں گنگا بہتی ہے'، ۱۹۶۴ کی 'سنگم'، اور ۱۹۶۹ کی 'جوکر'۔

بمل رائے کی ۱۹۴۴ میں بنی بنگالی فلم 'ادھائیر پاتھے'، ۱۹۵۲ کی ہندی فلم 'ماں'، ۱۹۵۳ کی 'دو بیگھہ زمین'، ۱۹۵۳ کی 'پرینیتا'، ۱۹۵۸ کی 'مدھومتی'، ۱۹۵۹ کی 'سجاتا'، اور ۱۹۶۳ کی 'بندنی'، دکھائی جا رہی ہیں۔

بی۔ این۔ ریڈی کی تیلگو فلموں میں سے جو اس میلے کے لئے منتخب کی گئیں، وہ ہیں، ۱۹۴۰ کی 'سمنگلی'، ۱۹۴۱ کی 'دیوتا'، ۱۹۴۲ کی 'پوتنا'، ۱۹۴۵ کی 'سورگ سیما'، ۱۹۵۱ 'ملیسوری'، ۱۹۵۵ کی 'بنگرو پاپا'، ۱۹۶۶ کی 'رنگلا رتن'، ۱۹۵۷ کی 'بھاگیا رتن'،

آڈور گوپال کرشنن کی ملیالم فلم 'ایلیپا تھم' کو برٹش فلم انسٹیچیوٹ کا ۱۹۸۲ کا، ایوارڈ اسی میلے میں دیا جارہا ہے۔ اس انسٹیچیوٹ کے ڈائریکٹر، لیزلی ہارڈ کاسل، خصوصی طور پر یہ ایوارڈ دینے کے لئے یہاں آئے ہوئے ہیں۔

یہ ایوارڈ ۱۹۵۸ سے لگاتار دنیا کے سب سے بڑے فلم میکر کو دیا جارہا ہے، ہر سال۔ لندن فلم فیسٹیول میں اس فلم کو چُنا جاتا ہے۔ ہندوستان کے صرف ایک اور فلمکار کو یہ ایوارڈ ملا ہوا ہے ____ 'ستیہ جیت رے' کو۔ رے، کو یہ ایوارڈ ان کی فلم 'اپور سنسار' کے لئے ملا ہے۔

آڈور گوپال کرشنن سے میں نے پوچھا، کہ رے کے ساتھ اس کی اس برابری کے بارے اس کو کیسا محسوس ہوتا ہے؟ کہنے لگا، وہ تو عظیم ہیں، ستیہ جیت رے! میں تو ان کا ایڈمائرر ہوں۔ پرستار۔ میری ان کی کیا برابری! یہ بات واقعی کوئی بڑا کلاکار ہی کہہ سکتا ہے۔ ورنہ آج کا یُگ تو 'میں یہ..... میں وہ.....' کا ہے۔

آڈور کی فلم 'ایلیپا تھم' یعنی 'چوہے کا پنجرہ' بڑی مضبوط، طاقتور فلم ہے۔ اس کے بارے آپ کو ابھی بتاؤں گی۔ پہلے آڈور کے بارے تھوڑی جانکاری۔

آڈور نے ۱۹۶۵ میں پُونا انسٹیچیوٹ سے فلم بنانے کا کورس کیا۔ 'ایلیپا تھم' اس کی تیسری فلم ہے۔

'سترہ سالوں میں صرف تین فلمیں؟'

'میرے کام کرنے کا سٹائل ہی یہی ہے، آہستہ آہستہ۔'

مگر آہستہ آہستہ کام کرتے ہوئے بھی آڈور نے اپنی پہلی فلم سے ہی سینما کی دُنیا کو ہلا دیا تھا۔ پہلی فلم کو ہی ایوارڈ مل گیا تھا۔

'ایلیپا تھم' شروع ہوتی ہے ایک چیخ سے۔ گھر کا مالک، بڑا بھائی، آدھی رات کو چیخ کر اُٹھتا ہے ____ 'مجھے چوہے نے کاٹ لیا ہے'۔ اس کی چھوٹی بہن، راجمنا،

لیمپ جلا کر دوڑتی آتی ہے۔ 'کہاں؟' اور سب لیمپ کی روشنی میں چوہے کو ڈھونڈنے لگتے ہیں۔ بھائی، راجنا، اور سب سے چھوٹی بہن سرسی دیوی۔ چوہا آگے آگے دوڑتا ہے، اور سارے لیمپ جلاتے ہوئے پیچھے پیچھے۔

یہ ایک چھوٹے زمیندار کا گھر ہے۔ آباؤ اجداد کا بنایا ہوا۔ سب کچھ پرانا۔ زنگ آلود۔ گاگریں، برتن، کنواں، پرچھتیاں۔

پرچھتی پر سے سرسی دیوی کو ایک پرانا چوہے کا پنجرہ ملتا ہے، اگلی صبح۔ جالے سے بھرا ہوا۔ اور اس میں ہر رات چوہے پھنسنے لگتے ہیں، جن کو وہ چھپڑ پر لے جا کر پنجرے کو پانی میں ڈبو کر چوہے مارتی ہے۔

بڑا بھائی بہت کمزور کیریکٹر ہے۔ سارا دن اونگھتا ہے۔ چھتری کے لئے، جوتے کے لئے، کافی کے لئے، وقفے وقفے سے راجنا کو آواز دیتا رہتا ہے۔ صاف دھلے استری کئے ہوئے کپڑے پہن کر بس اپنے کھیتوں کا ایک چکر لگا آتا ہے، جہاں اس کے مزدور کام کرتے ہیں۔ اور اگر اخبار پڑھتا رہتا ہے۔ صبح دیر سے اٹھتا ہے۔

راجنا کی شادی کی عمر گزرتی جا رہی ہے۔ اس کی شادی شاید وہ جان بوجھ کر نہیں کرنا چاہتا۔ اگر کبھی کوئی رشتہ آ بھی جائے، تو نقص نکال کر واپس موڑ دیتا ہے۔ اور راجنا جو گھر آئی فصل سے لے کر گھر سنبھالنے تک، رات کو چوروں کا خیال رکھنے سے لے کر، سب کی خدمت کرنے تک، سب گرہستی کا بوجھ اٹھائے بیٹھی ہے، بے حد اداس ہے۔ اس کی عمر کی لڑکیاں اپنے گھروں میں بس رہی ہیں، اور بچے پیدا کر رہی ہیں۔

سکول میں پڑھتی سرسی دیوی جو کئی بار فیل ہو چکی ہے، پڑھائی کے بہانے کسی کام کو ہاتھ نہیں لگاتی۔ صرف اس نے اپنے ماسٹر سے عشق کرنا شروع کر دیا ہے۔ اور ایک دن گھر سے بھاگ جاتی ہے۔

اور راجنما نمک کی ڈھیلی کی طرح آہستہ آہستہ گھلتی جاتی ہے۔

اتنے حوصلے والی عورت، زندگی کے ساتھ اتنی بھرپور، پاورفل، اُس کا یوں آہستہ آہستہ گھُلنا آپ کے دِل کو آہستہ آہستہ چیر کے لگاتار رہتا ہے۔ مگر اس کا گھر، اس کا بھائی اور صدیوں سے اس کی ہڈیوں کے اندر رمیرو ا میں تہذیب کا زہر، جس میں عورت کو اپنے لئے بول سکنے کا کوئی حق نہیں ـــ اُس کا جرم ہے کا پنجرہ ہے۔ پنجرے میں بند، صرف پھڑپھڑا کے پانی میں ڈوب کر مر جانا ہی اس کی تقدیر ہے۔

ویسے راجنما، ابسن کے 'ڈالز ہاؤس' کی 'نورا' سے ملتی ہے۔ نورا کی طرح ہی وہ اپنے گرد صورتِ حال اور مسائل کا بوجھ اپنے جاندار کندھوں پر اٹھائے رکھتی ہے۔ مگر نورا مغربی عورت تھی، آخر کار گھر سے سب کچھ چھوڑ کر چلی گئی۔ راجنما ہندوستان کے ایک گاؤں کی عورت ہے۔ گھر سے جاتی ہے، مگر چار آدمیوں کے کندھوں پر۔ ہسپتال۔ اس کی زندگی کا زہر اس کے پیٹ میں تیز درد بن کر پھیل گیا ہے۔

لیکن اس جنوبی ہندوستان کے چھوٹے سے گاؤں کے اس گھر کو جس طرح آدور نے رچترا ہے، وہ کمال ہے۔

'ہندوستانی پینورا ما' میں آج تک دیکھی فلموں میں سب سے طاقتور فلم مجھے 'چوکھاں' لگی ہے۔ چوکھ یعنی آنکھیں۔

اُتپلیندو چکرورتی کی یہ بنگلہ فلم دیکھتے ہوئے جسم کے سارے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں، اور انسان کو اپنی بے چارگی کا اتنا تیکھا احساس ہوتا ہے، کہ محض زندہ رہنے سے اور محض زندہ رہے جانے کے اس سارے تردّد سے شرم آنے لگتی ہے۔ اس ملک یعنی دیوتاؤں کی نگری بھارت ورش میں دن دیہاڑے کیا ہوتا ہے، ہمارے آس پاس کتنی بے انصافی، کتنی نفرت، کتنا پاکھنڈ، کتنا تکبر ہے، کتنی بے ایمانی اور بدکرداری، اس سب کا شدت کے ساتھ احساس کرانے والی اس فلم کو دیکھ کر نہ بندہ پھر آرام سے

روٹی کھا سکتا ہے، نہ سو سکتا ہے۔

فلم شروع ہوتی ہے، کلکتے کے ایک سرکاری ہسپتال کے آنکھوں کے کلینک سے۔ آنکھوں کی بیماریوں سے پریشان بچے، عورتیں، مرد، بزرگ۔ ہسپتال میں اپنی باری کا انتظار کرتے ہوئے۔

ایک نوجوان، اندھے، پھٹے حال مزدور کو لے کر اس کی ماں برآمدے برآمدے گھومتی ہوئی۔

آنکھوں کا بڑا ڈاکٹر، ڈاکٹر مکرجی، اپنے سٹوڈنٹس کو لیکچر دیتا ہوا کہ آنکھوں کی بیماریاں 'وٹامن اے' کی کمی کی وجہ سے پیدا ہوتی ہیں۔ جس ملک میں پچانوے فیصدی لوگ رج کر روٹی نہیں کھا سکتے، وہ 'وٹامن اے' والی خوراک، یعنی دودھ، پھل کس طرح استعمال کر سکتے ہیں؟ اس لئے اس ملک کے آدھے بچوں کو بچپن میں ہی آنکھوں کے روگ لگ جاتے ہیں۔

ہسپتال کا ایک چپڑاسی بیڑی پیتا ہوا، اس اندھے مزدور، اور اس کی بوڑھی ماں کو ساتھ لے کر ہسپتال کے سپرنٹنڈنٹ کے پاس جاتا ہے "صاحب! کل ایک جوڑا آنکھوں کا 'آئی بنک' میں آرہا ہے۔ وہ آنکھیں اس آدمی کو لگا دیں، اپریشن کر کے۔ کارنیا ری گرافٹنگ۔ یہ تین سالوں سے اس اپریشن کا انتظار کر رہا ہے۔"

اس اندھے مزدور کی ماں بلکتی ہوئی، مریل آواز میں "صاحب! یہ میرا ایک ہی بیٹا ہے۔ فیکٹری میں کام کرتے ہوئے لیمپ پھٹ جانے کی وجہ سے اس کی نظر جاتی رہی۔ اس کا اپریشن کر کے یہ آنکھیں اس کو لگا دیں۔ تین سال سے یہ بیکار بیٹھا ہے۔ ہم ڈاکٹر صاحب بھوکے مر رہے ہیں۔"

ڈاکٹر چپڑاسی سے پوچھتا ہے "لیکن تمہیں کس طرح پتہ ہے، کہ کل کوئی آنکھیں ڈونیٹ ہو کر آرہی ہیں؟"

"جی وہ میرا دوست ہے۔ کل اس کو پھانسی ہو جائے گی۔ اور اس نے آنکھیں ڈونیٹ کرنے کے لئے جیل کے صاحب کو لکھ دیا ہے، اور یہ بھی کہا ہے، کہ اس کی آنکھیں اسی مزدور کو دی جائیں"

"اچھا، کل دیکھیں گے۔ ابھی ہمارے پاس آنکھیں آ تو لیں"

ایک موٹا سیٹھ۔ جیڈریا۔ جیڈریا جوٹ مل کا مالک۔ اس کے بیٹے کو بھی کسی پرائیویٹ ہسپتال میں دکھانے کے لئے اس کی ماں لائی ہے۔ فیکٹری کے نزدیک کوئی بم پھٹا تھا، جس سے اس کی آنکھوں کی روشنی جاتی رہی۔ ڈاکٹر کہتا ہے، کہ صرف ایک ہی علاج ہے، کارنیاری گرافٹنگ۔ اور آنکھوں کے بارے سرکاری ہسپتال سے پوچھیں۔ کوئی نہ کوئی آنکھوں کا جوڑا "آئی بنک" میں آتا ہی ہوگا۔ آنکھیں مل جائیں، تو فوراً اپریشن کروالیں"

اور پھر شروع ہوتی ہے ایک خوفناک دوڑ۔ کل پھانسی لگنے والے مزدور کی آنکھوں پر قبضہ کرنے کی سازش۔ جیڈریا ہسپتال جاتا ہے۔ مگر وہاں تو کیو ہے۔ لوگ مہینوں سے ہسپتال کے برآمدوں میں چٹائیاں بچھا کر سو رہے ہیں۔ اندھے۔ آنکھوں کے اپریشن کی اُمید میں۔ کہیں سے آنکھیں آئیں، کوئی ڈونیٹ کرے، اور اُن کا اپریشن ہو۔

اور جیڈریا ہیلتھ منسٹر کے پاس جاتا ہے۔ کلکتے کی رائیٹرز بلڈنگ میں، جس بلڈنگ کے اُوپر ایک بُت ہے، اور نیچے لکھا ہے "جسٹس"

منسٹر کا فون ہسپتال کے سپرنٹنڈنٹ کو۔ "وہ آنکھیں جو کل آرہی ہیں، جیڈریا صاحب کے بیٹے کو ہی ملیں"

"یس سر۔ اٹ وِل بھی ڈن سر۔ نو پرابلم سر"

اور وہ اندھا مزدور اور اس کی اندھی ماں، اور دو تین اور مزدور، اور

ہسپتال کا چپڑاسی، اُن کا دوست برآمدوں میں گھوم رہے ہیں۔ ایک دروازے کے بعد دوسرے دروازے پر دستک دیتے ہیں، ہسپتال کے تمام بڑے افسروں کی منتیں کرتے۔

چپڑاسی کو جیڈیا نظر آتا ہے۔ اور جیڈیا کا بیٹا، جس کو شام کو ہسپتال میں داخل کروا دیا ہے، صبح اپریشن کے لئے۔ اور وہ گھر آکر اپنے ساتھیوں کو بتاتا ہے "گھپلا ہے"!

رات کو دس بجے چپڑاسی اور دو مزدور آنکھوں کے سپیشلسٹ ڈاکٹر ٹنکر جی کے گھر جاتے ہیں، اور اس کو ساری بات بتاتے ہیں۔

چپڑاسی کہتا ہے "میں پہلے جیڈیا کا ڈرائیور ہوتا تھا۔ سات سال پہلے اس کی نوکری میں نے چھوڑ دی۔ کیونکہ میرے سامنے، میری آنکھوں کے سامنے، جو قتل ہوتے تھے، جو سازشیں ہوتی تھیں، وہ میری برداشت سے باہر ہو گئیں۔ ایک سال میں بیکار رہا۔ بھوکا مرتا رہا۔ پھر مجھے اس ہسپتال میں نوکری مل گئی۔ اور میں سارا قصہ میں آپ کو سُناتا ہوں"

پھر شروع ہوئی، فلم کی فلیش بیک۔ جیڈیا مل میں ہڑتال۔ مل مزدوروں کی یونین کا لیڈر، جادو ناتھ۔ (اوم پوری نے کمال کی ایکٹنگ کی ہے، جادو ناتھ کے کردار میں۔ پتھر میں سے گھڑ کر تراشا ہوا چہرہ، درد سے بھری آنکھیں۔ فولادی ارادہ۔ منہ پر چیچک کے داغوں نے اس چہرے کو ٹھوس، پتھریلا بنا دیا ہے۔ یہ ہے اوم پوری۔ نیشنل سکول آف دہلی کا کمال ترین ایکٹر۔ پنجابی لڑکا۔) جیڈیا نے مل میں سے کچھ مزدوروں کو نکال دیا ہے، اور مزدوروں نے ہڑتال کر دی ہے "ہمارے بھائیوں کو واپس بحال کرو، تو یہ ہڑتال ٹوٹے گی"

ہڑتال توڑنے کی کوششیں۔ نئے مزدوروں کو رکھنے کی کوششیں۔ سازشیں۔ پولیس کی مدد۔ جیڈیا پولیس انسپکٹر کو اس طرح حکم دیتا ہے، جیسے وہ ڈائرکٹر جنرل

آف پولیس لگا ہو، اور یہ سارے انسپکٹر اس کے لونڈے ہیں، اس کے غلام۔
'اوئے انسپکٹر، تم سے یہ کیڑے مکوڑے بھی نہیں سنبھالے جاتے؟ بالکل تم حرامی ہو۔
کام ہی نہیں کر سکتے۔ ایک طرف بیٹھو، اب میں خود اُن کو سیدھا کروں گا!'
اور سیدھا کرنے کے لئے ہیں غنڈے، نوجوان لیڈر، پالیٹشنوں کے دلال، اور سرکار۔ پوری سرکار۔ منسٹر، وزیر، سب۔

غنڈوں کا مزدوروں کی بستی پر حملہ۔ عورتوں کی بے حرمتی۔ چائے پیتے بزرگوں کے پیٹ میں چھرا۔ چائے بناتی سفید بالوں والی عورت کا گلی میں گھسیٹا جانا، اور چار مزدوروں کو پکڑ کر وہ ساتھ لے گئے۔ ایک اُجاڑ جگہ پر لے جا کر، ہاتھ پیچھے باندھ کر گولی مار دی۔ اور لاشوں پر لکھ کر رکھ دیا ' جادو ناتھ، لال سلیوٹ!'

اور جیٹیا کے دفتر میں ہو رہا، ان غنڈوں کا جشن۔

اور پھر قتل ہوا مِل کا مینجر، اور شک میں قید ہوا جادو ناتھ۔ سات آٹھ سال جیل میں سار کر حکم ہوا پھانسی کا۔

پھانسی سے ایک دن پہلے، اس کی بیوی اور کچھ مزدور دوست اس کو جیل میں ملنے کے لئے آتے ہیں۔ وہ باہر کہتا ہے 'باہر کیا، اور اندر کیا! باہر تھوڑی سی جگہ ہی تو زیادہ ہے۔ باقی تو غریب آدمی نے مشقت کر کے ہی پیٹ بھرنا ہے۔ باہر کیا، اور اندر کیا!'

بیوی چپ چاپ روتی ہے۔ ہاری ہوئی، مصیبت زدہ عورت! اور مزدور اپنی بے بسی میں صرف بیڑی سلگا کر کش لیتے ہیں۔

'یہ خط لکھا ہے، میں نے جیل کے داروغے کو۔ اس کی کاپی بنا کر تمہارے لئے رکھی ہے۔ لکھا ہے، کہ میری پھانسی کے فوراً بعد میری آنکھیں نکال لی جائیں۔ لیکن ذرا احتیاط سے۔ کیونکہ یہ آنکھیں میں اپنے مزدور بھائی کو دینا چاہتا ہوں۔ اُس

کا اپریشن کر کے میری آنکھیں اس کو لگا دی جائیں۔

اور پھر بیڑی پیتا ہوا کہتا ہے "غریب آدمی کا تو ہر جگہ پر مرنا ہے۔ باہر ہوتا تو ذرا ذرا کر کے مرتا، اور اب بس، کھٹاک سے۔ کیا فرق ہے!"

خط میں لکھا ہے "جس قانون کے مطابق مجھے پھانسی دی جا رہی ہے، اُسی قانون میں ایک یہ بھی شرط ہے، کہ میری آخری خواہش کا احترام کیا جائے۔ ویسے تو مجھے علم نہیں، کہ اس ملک میں ابھی بھی کوئی قانون و نون چلتا ہے، کہ نہیں، لیکن اگر قانون کی کوئی اہمیت ہے، تو میری آخری خواہش پوری کی جائے۔ آخری خواہش میری یہ ہے، کہ میری آنکھیں میری پھانسی کے بعد احتیاط سے نکال لی جائیں، تاکہ دونوں آنکھیں میرے مزدور ساتھی کو ٹرانسپلانٹ کی جا سکیں، جس کی آنکھیں تین سال پہلے فیکٹری میں ایک لیمپ پھٹنے سے ضائع ہو گئیں تھیں۔ میری آنکھوں نے جو سپنا دیکھا تھا، وہ یہ سپنا پورا ہوتا بھی دیکھ سکیں۔ یہی میری آخری تمنا ہے۔"

اور ڈاکٹر مکرجی کو وہ دونوں مزدور اور ہسپتال کا وہ چپڑاسی جادو ناتھ کا وہ خط دکھاتا ہے۔

ڈاکٹر کہتا ہے، "میں اپنی طرف سے پوری کوشش کروں گا۔"

اگلی صبح۔

ایک آئس بکس میں جادو ناتھ کی آنکھیں ہسپتال میں لائی گئیں، اور ایک بڑے فریزر میں رکھ دی گئیں۔ فریزر پر لکھا ہے "آئی بنک"۔

اور شروع ہوئی ایک خوفناک جدوجہد اُن آنکھوں کے لیئے۔

اتنی دیر میں سارے کاغذات بدلے جا چکے ہیں۔ ویٹنگ لسٹ بدلی جا چکی ہے، اور سب سے پہلا نام ہے، جیڈیا کے بیٹے کا۔

ڈاکٹر مکرجی کو اپریشن کی تیاری کا حکم ہوا۔ وہ فائل دیکھنا چاہتا ہے۔

وہ کہتا ہے، کاغذات کو دیکھے بغیر میں اپریشن نہیں کروں گا۔

باہر، ایک طرف کھڑے مزدوروں کو وہ کہتا ہے، میں تو اڑ گیا ہوں۔ مگر میں اکیلا کیا کروں گا؟ دوسری طرف وہ سب ہیں۔ تمہارے لیڈر کہاں ہیں؟ اُن کو لے کر آؤ، پروٹسٹ کرنے کے لیئے۔

لیکن اس طرح کی مصیبت کے وقت لیڈر کہاں ملتے ہیں؟

اور اپریشن چوبیس گھنٹوں کے اندر اندر ہونا ہے۔ کیونکہ چوبیس گھنٹوں کے بعد فریزر میں پڑی آنکھیں خراب ہو جاتی ہیں۔

جیڈیا بھاگتا پھر رہا ہے۔

جلدی سے ایک نرسنگ ہوم کے ڈاکٹر کو بلایا گیا ہے۔ عجلت میں باقی، ڈاکٹروں کی میٹنگ ہوتی ہے، سپرنٹنڈنٹ کے کمرے میں۔ 'یہ سالا مکرجی پالیٹکس کر رہا ہے۔ نکیلی ہے۔ نمٹ لیں گے اس سے بھی، بعد میں۔ فی الحال اپریشن نرسنگ ہوم میں ہوگا، اور ہسپتال سے آنکھیں جائیں گی۔ ٹھیک؟'

ٹھیک۔

لیکن دوسری طرف مزدور اکٹھے ہو رہے ہیں۔ جادو ناتھ کی لاش ابھی اس کے گھر والوں کو نہیں دی گئی۔ مگر جادو ناتھ کی بیوی، دکھ میں پاگل، اکیلی عورت، بھی اُٹھ کھڑی ہوتی ہے۔ 'وہ آنکھیں میرے خاوند کی ہیں، کیوں دی جائیں گی اُس کے دشمنوں کو؟'

فائل جیڈیا کے پاس ہے۔ وہ اس کو ڈائریکٹر کے پاس لے جا رہا ہے۔ کار میں، پان کھاتا ہوا مطمئن، کار کے سٹیریو پر بیگم اختر کی غزل سنتا ہوا۔ وہ فائل کھول کر پڑھتا ہے۔ 'ہیں؟ یہ آنکھیں جادو ناتھ کی ہیں؟ غضب!'

اور اس کو یاد آتی ہیں، جادو ناتھ کی آنکھیں۔ وحشت سے، ڈر سے، غصّے

سے بھری آنکھیں۔ اور اس کو لگتا ہے، ساری عمر وہ آنکھیں، جادو ناتھ کی آنکھیں اس کو ڈانٹا کرتی رہیں گی۔ دن رات، ہر روز، ہر روز۔ وہ اس کے بیٹے کو اس کی طرف دیکھیں گی، اور اس کی روح کانپتی رہے گی۔

نہیں، ہرگز نہیں۔ یہ آنکھیں میں اپنے بیٹے کے چہرے پر نہیں دیکھ سکتا — وہ سوچتا ہے۔

اور پھر تیار ہوتی ہے، ایک خوفناک سکیم۔ جیڈیا کے ساتھ ہر وقت سائے کی طرح رہنے والے لوگ — ایک نوجوان لیڈر، ایک ممبر اسمبلی۔ ہسپتال کے سپرنٹنڈنٹ کو کہتے ہیں، "یہ آنکھیں نہ جیڈیا کے بیٹے کو چاہئیں، اور نہ ہی یہ کسی اور کو ملنی چاہئیں۔ اس طرح تو وہ جادو ناتھ "شہید" بن جائے گا، اور وہ مزدوروں میں ہمیشہ زندہ رہے گا۔ پہلے بھی ہم نے اسے بڑی مشکلوں سے ختم کیا ہے۔ ان کو آئی بنک سے اڑا کر ہمارے حوالے کر دو۔"

سپرنٹنڈنٹ جھجکتا ہے۔ "لیکن آئی بنک میں داخل ہوئی آنکھیں میں کس طرح چوری کروا دوں؟"

"کیوں؟ جب ہزاروں روپے کی دوائیں ہسپتال سے چوری کروا کر تم باہر فروخت کرتے ہو، اور ہماری مدد لیتے ہو، تب؟" — نوجوان لیڈر اس کو ڈانٹتا ہے۔

اور آنکھیں چوری کر کے اُن لوگوں کے حوالے کر دی گئیں۔

باہر، ایک اجاڑ جگہ انہوں نے گڑھا کھودا، اور اُن آنکھوں کو اس گڑھے میں دبا دیا۔

ایک اور بہت پاورفل فلم — "ہُوز لائف از اٹ اینی وے؟" امریکہ

کے 'جوہن بیڈہوم' کی ڈائیریکٹ کی ہوئی۔

اس طرح کی فلم دیکھ کر حیرانی ہوتی ہے، کہ اس طرح کی فلمیں، فلم فیسٹیول میں ہی کیوں آتی ہیں؟ ویسے پورا سال جو فلمیں امریکن، یہاں خرید کر دکھائی جاتی ہیں، ان میں سے نوے فیصدی تو 'ٹھاہ ٹھاہ' والی فلمیں ہوتی ہیں۔ کاؤبوائے فلمیں۔ اور کچھ ہوتی ہیں، سائینس فکشن کی فلمیں۔ سپیس فلمیں۔

اس طرح کی فلم دیکھ کر امریکن فلموں بارے سوچ بدلتی ہے۔

یہ بڑی ہی سینسٹو فلم ہے۔ بے حد سینسٹو ایکٹنگ۔ تیکھی، شدید، اینٹنس ڈائیریکشن۔ اعلی فوٹو گرافی۔

ایک نوجوان سکلپچر۔ بت تراش۔ اپنا ایک بہت بڑا بت کرین میں بیٹھ کر ایک پبلک پارک میں لگوا رہا ہے۔ بے حد خوش۔ اپنا ایک بڑا کام پورا ہونے کی انوکھی خوشی اور تسلی۔ اور ساتھ ہے، اس کی محبوبہ، جو بیلے ڈانسر ہے، اور اس کی ماڈل بھی۔

بے حد خوش وہ کار چلا رہا ہے، کہ ایک خوفناک ایکسیڈنٹ ہو جاتا ہے، اور وہ بُری طرح زخمی ہو جاتا ہے

ہسپتال۔ ایکس رے۔ کئی ہڈیاں ٹوٹی ہوئی ہیں۔ اور ریڑھ کی ہڈی کے دو ٹکڑے ایک دوسرے پر چڑھے ہوئے۔

اپریشن۔ ہڈیاں جوڑ دی گئی ہیں۔ ریڑھ کی ہڈی کے ٹکڑے سیدھے کر دئیے گئے ہیں۔ لیکن کئی نروز ٹوٹ گئی ہیں۔ اور ان نروز کا تعلق اس کی ٹانگوں اور بازوؤں سے ہے۔

ایکسیڈنٹ اپریل میں ہوا تھا۔ وہاں سے سیدھے ہم پت جھڑ کے موسم میں پہنچتے ہیں، جب وہ ہسپتال کی چارپائی پر پڑا ہے۔ نرسیں اٹھاتی ہیں، تو بیٹھ

جاتا ہے۔ اور نرسوں کے ساتھ مذاق کرتا ہے۔ ہنستا ہے۔ گپیں مارتا ہے۔ نرسیں کروٹ بدلواتی ہیں، تو کروٹ بدل لیتا ہے۔ نرسیں روزانہ پیٹھ ملتی ہیں، اور ٹانگوں پر مالش کرتی ہیں، تاکہ بیڈ سور نہ ہو جائے۔ رات کو سوتے وقت اس کی ٹانگوں کے درمیان تکیئے رکھ دیئے جاتے ہیں، اور بازوؤں کے نیچے بھی تکیئے۔ ساری رات ایک ہی کروٹ پر پڑا رہنے سے بستر سے رگڑیں نہ لگ جائیں۔

'اب میرا کیا کرو گی؟' وہ ڈاکٹروں سے پوچھتا ہے۔

'چھ ماہ کے بعد تمہیں ایک ہوم میں ٹرانسفر کر دیں گے۔'

'تو آپ گوبھی (کیبیج جز) بوتے تو یہاں ہیں، اور پرپیزرو ایک اور کولڈ سٹور میں کرتے ہیں؟' وہ کڑوی ہنسی ہنستا ہے۔

اس کی محبوبہ روزانہ آتی ہے۔ وہ کہتا ہے 'تم نہ آیا کرو۔ اب تم اپنی زندگی کو کوئی نئے معنی دو۔ میں تو مر چکا۔ تم آتی ہو، تو مجھے وہ وقت یاد آتا ہے، جب میں جیتا تھا، تو مجھے بڑی تکلیف ہوتی ہے۔'

اور اس کی بے چینی بڑھتی جا رہی ہے۔ ہر روز۔

وہ ڈاکٹروں سے کہتا ہے 'آپ مجھے بیس پچیس سلیپنگ پلز کیوں نہیں دے دیتے؟ میں خود تو کھا نہیں سکتا۔ میرے ہاتھ ہی نہیں۔ دینی تو آپ کو ہی پڑیں گی۔' اور ہنستا ہے۔

لیکن ڈاکٹر کہتے ہیں 'ہم زندگی دیتے ہیں، لیتے نہیں۔'

وہ چیختا چلاتا ہے۔ لیکن اس کی جھنجلاہٹ صرف اس کے چہرے تک محدود ہے۔ باقی جسم تو بے جان ہے۔

ڈاکٹر کہتا ہے 'اس کو مارفیا کا انجکشن دے کر سلا دو۔'

انجکشن لگانے کی ڈیوٹی جس ڈاکٹر کی لگی ہے، وہ خوبصورت جوان عورت ہے۔

دیکھو! مجھے کیوں انجکشن دے رہے ہو؟ میں سونا نہیں چاہتا۔ ایک ہی تو چیز بچی ہے میرے پاس، میرا دماغ۔ میں سوچنا چاہتا ہوں، کہ کس طرح مر سکتا ہوں۔ یہاں سے میرا کس طرح چھٹکارا ہو سکتا ہے۔

ڈاکٹر اس کے درد سے پگھل جاتی ہے۔ اس کی اس سکلپ چر کے ساتھ پوری ہمدردی ہے۔ لیکن وہ اس کو مرنے بھی تو نہیں دے سکتی۔ میڈیکل ایتھیکس۔

اور آخر وہ تین چوتھائی مر چکا بندہ، ایک چوتھائی جیتے رہنا جس کا سراپ ہے، اپنے وکیل کو کہتا ہے مجھے یہاں سے کسی طرح نکالو۔ اگر میں یہاں سے چلا جاؤں، تو خود ہی مر جاؤں گا۔ کیونکہ یہاں ہر چوتھے روز میرا ڈائیلیسز ہوتا ہے۔ وہ نہیں ہوگا، تو خود ختم ہو جاؤں گا۔ اور کچھ کرنے کی ضرورت نہیں۔

وکیل کو لگتا ہے، یہ تو اس کے ہاتھوں قتل ہو جائے گا۔ اور آخر وہ کچہری میں درخواست دے دیتا ہے، کہ میرا موکل ہسپتال میں سے رہا ہونا چاہتا ہے۔ اور ہسپتال کے ڈاکٹر اس کو اس کی مرضی کے خلاف اس کو وہاں باندھ کر نہیں رکھ سکتے۔

مقدمے کی سماعت کے لئے جج ہسپتال کی لائبریری میں ہی کچہری لگاتا ہے۔

"تم رحمدل جج ہو، کہ پھانسی لگانے والے جج؟" سکلپ چر اس کے ساتھ مذاق کرتا ہے۔

ڈاکٹر کوشش کرتے ہیں، کہ اس کو مینٹل ڈسٹرب قرار دے کر یہ ثابت کر سکیں، کہ کیونکہ اس حادثے سے اور پیرالائز ہو جانے سے اس کا دماغ ہل گیا ہے، وہ اپنے بارے درست فیصلہ نہیں کر سکتا۔

لیکن ایک باہر کے سائیکی ایٹرسٹ رائے ہے، کہ اس کی قوتِ سوچ بالکل ٹھیک ہے۔ وہ عقلمندی کی بات کرتا ہے، اور اپنے بارے فیصلہ کرنے کے بھی قابل ہے۔ لیکن پھر بھی میڈیکل ایتھیکس کے مطابق اس کو مرنے کی اجازت نہیں دینی چاہیئے۔

یہاں ایکٹنگ کمال ترین ہے۔

کمرے میں اتنا کھچاؤ ہے، اتنا تناؤ ہے، اور اس سکلپ چیر کے چہرے پر عجیب بے بسی، ڈر، جلال، غصّہ۔

'کیوں؟ کیوں میں نہیں مر سکتا؟ میں سکلپ چیر ہوں۔ میری ساری زندگی کا مقصد، میری ساری زندگی کی اہمیت یہ تھی، کہ میرے ذہن میں ایک وجود اُبھرے اور میری انگلیاں اس کی ترجمانی کریں۔ اب میرا یہ ذہن ہی میرا دشمن ہے۔ میری سوچ اسی طرح ہے ــــــ تیکھی، شفاف۔ لیکن میری انگلیاں مر چکی ہیں۔ میری یہ تیکھی شفاف سوچ ہی اب میری سب سے بڑی دشمن ہے۔ مجھے دن رات ٹارچر کرتی ہے۔ مجھے تم اس طرح ذبح ہونے سے نجات کیوں نہیں دلا سکتے؟'

اور پھر ہاری ہوئی آواز میں جس میں سمندروں جتنی گہری منت بھی شامل ہے۔ 'ایک جانور کو کسی حادثے میں کچلا اور تڑپتا دیکھتے ہو، تو اس پر ترس کھا کر گولی مار دیتے ہو، اس کو 'مرسی کلنگ' تم انسان پر ترس کیوں نہیں کھاتے؟ انسان کو اس زندہ موت کی سزا کیوں دیتے ہو؟ میں اُبلی ہوئی گوبھی بن کر نہیں جینا چاہتا۔ یہ آخر میری اپنی زندگی ہے۔ اس کے بارے میرے فیصلے کی ہی سب سے زیادہ اہمیت ہونی چاہیئے!'

اور جج کچھ دیر کے لئے کچہری برخواست کر کے باہر جا کھڑا ہوتا ہے۔ باہر برف پڑ رہی ہے۔ برف میں اکیلا کھڑا ہو کر سوچتا ہے، اور واپس مڑ کر فیصلہ سُناتا ہے۔

'یہ اپنی زندگی کے لئے آپ فیصلہ کرنے کے لئے خود مختار ہے'۔

پہلی بار سکلپ چیر کی آنکھیں بھیگ جاتی ہیں، مُسکرانے کے ساتھ۔

وکیل کی بھی۔ اس ڈاکٹر کی بھی، جس کے مَن نے اس کے ساتھ درد کا رشتہ بنا لیا تھا۔

اور جج اس کے پاس کھڑا ہو کر پوچھتا ہے۔ 'کوئی بھی فیصلہ میں دیتا، کہنا تو میں نے پھانسی دینے والا جج ہی تھا نا؟'

'لنڈسے اینڈرسن'، بریٹن کا مشہور و معروف ڈائریکٹر ہے۔ پہلے وہ خود فلم کریٹک ہوتا تھا۔ پھر اُس نے خود فلمیں بنانی شروع کیں، تو برٹش فلم انڈسٹری کا 'اینگری ینگ مین' کے طور پر پہچانا جانے لگا۔ ۱۹۴۸ء سے ۱۹۶۰ء کے دوران چھوٹی فلمیں بنائیں۔ جن میں سے 'تھرسڈےز چلڈرن' کو ۱۹۵۳ء میں 'آسکر ایوارڈ' ملا۔ ۱۹۵۰ اور ۱۹۵۸ء کے درمیان اس نے نیشنل فلم تھیٹر میں 'فری سینما موومنٹ' شروع کی۔ ۱۹۶۳ء میں پہلی فیچر فلم بنائی 'دِس سپورٹنگ لائیف'، تیسری فلم 'اِف' کو ۱۹۶۹ء میں 'کنا فلم فیسٹیول' میں 'گرانڈ پری' ایوارڈ ملا۔

بنگلور میں پیدا ہوا لنڈسے اینڈرسن، آج جیسے واپس اپنے گھر آیا ہے، ساٹھ سال کے بعد۔ اور اس نویں انٹرنیشنل فلم فیسٹیول کی جیوری کا ممبر ہے۔

اس کی فلم جو اس میلے میں دکھائی جا رہی ہے 'برٹینیا ہاسپیٹل'، آج کی برطانوی سوسائٹی پر بڑا تیکھا طنز ہے۔ یہ اور بات ہے، کہ جب اس نے 'اِف' بنائی تھی، تو اس وقت کی لیبر سرکار کو وہ اپنے خلاف معلوم ہوئی تھی، اور 'برٹینیا ہاسپیٹل' شاید وقت کی ٹوری سرکار کو اپنے خلاف محسوس ہو گی۔

'برٹینیا ہاسپیٹل' میں پرائیویٹ وارڈ میں کوئی تیس پینتیس لوگ داخل ہیں، اور ان کے روز کے ایک وقت کے کھانے کا بل دو ہزار پونڈ سے بھی زیادہ آتا ہے۔ (یعنی سارے دن کی روٹی کا بل کوئی ایک لاکھ روپے) اور ان کا کھانا باہر مہنگے ہوٹل سے منگوایا جاتا ہے۔ باقی جنرل وارڈز کے مریض، ساری دنیا کے جنرل وارڈز کے مریضوں کی طرح دھکّے کھاتے ہیں، خراب ہوتے ہیں۔ ایک بوڑھا آخری سانس سانس لیتا ہوا اسپتال میں لایا جاتا ہے۔ تین ڈاکٹر بیٹھے ہیں، چائے پی رہے ہیں۔ وہ تینوں لاپرواہی سے اس کو برآمدے میں ہی سٹریچر پر پڑا چھوڑ کر گرم کافی پینے چلے جاتے ہیں۔ نرس اُدھر سے سگریٹ سلگاتی ہوئی گزرتی ہے۔ کہتی ہے، 'ڈیوٹی

ختم ہونے میں صرف دس منٹ رہ گئے ہیں، اور میں چلی ہوں۔ میں کیا کروں؟ اور وہ بوڑھا سالہی، اکیلا ویران برآمدے میں دم توڑ جاتا ہے۔

ہسپتال کے باورچی خانہ میں ہڑتال ہے۔ کھانا پکانے والا اسٹاف کہتا ہے کہ اگر ہم پرائیویٹ وارڈ والوں کے لئے روٹی پکانے کے قابل نہیں سمجھے جاتے، تو پھر ہم کو روٹی پکانی آتی ہی نہیں۔ اس لئے نہیں پکاتے۔ موج کرو؛

ڈاکٹروں کی ہڑتال ہے۔ ہم کو تنخواہ زیادہ دو۔ ورنہ ہم کام نہیں کرتے؛

شہر میں فساد ہو گئے ہیں۔ زخمی، خون بہتے، جلے ہوئے مریض ہسپتال میں آرہے ہیں۔ لیکن ہسپتال میں تو ہڑتال ہے۔ جو ڈاکٹر ڈیوٹی پر ہیں، وہ اس فالتو کام کے لئے پہلے دُگنی تنخواہ پر اوور ٹائم ملنے کی شرط منواتے ہیں۔ ساتھ ساتھ ایکسپنسز اور کافی بھی ملنی چاہیئے۔

سب سے بڑی مصیبت تو یہ ہے، کہ اسی دن ملکہ الزبتھ کی ماں، بڑی مہارانی ہسپتال میں آرہی ہے۔ ہسپتال کی سالگرہ منانے کے لئے جو جوبلی ہو رہی ہے، اس کی وہ 'چیف گیسٹ' ہے۔ اور کانفرنس ہو رہی ہے ___ ہسپتال کے ڈائریکٹروں کی، بڑے ڈاکٹروں کی، اور باہر سے آئے سرجیکل کے ماہرین کی، اور سکاٹ لینڈ یارڈ کے افسروں کی، جو ملکہ کی ماں کی حفاظت کے ذمہ دار ہیں۔

اس سارے تناؤ میں فلم چلتی ہے۔

ایک ہسپتال کا بڑا ڈاکٹر ہے، جو جینیٹکس پر ریسرچ کر رہا ہے۔ وہ اپنی ریسرچ کے لئے مرر ہے مریضوں کی آکسیجن کی ٹیوب سمارٹ کر اُن کو پار بُلاتا رہتا ہے۔ اور تازے مرے ہوئے جسموں کی ٹانگیں، بازو، پھیپھڑے، گُردے، دل، دماغ نکال نکال کر فریزر روم میں سنبھالتا جاتا ہے۔

ملکہ کی ماں کے سامنے اس نے اپنا چمتکار دکھانا ہے۔ یہ سب مختلف ٹکڑے سی کر زندہ بندہ تیار کرنا ہے۔

آخری وقت پر پتہ چلتا ہے، کہ کاٹ کر رکھا سر خراب ہو چکا ہے۔
افراتفری میں اس رپورٹر کا سر قصائی کی بڑی موٹی چھری کے ساتھ، جو چپ چاپ چوری چوری اس ساری کاروائی کی فلم تیار کر رہا تھا۔

اور سر کو دھڑ سے، اور دھڑ کو بازو، ٹانگوں کے ساتھ بوری کی طرح سی دیا جاتا ہے۔ بوری میں پھیپھڑے، دل، دماغ سب کچھ بھر کر۔ اور اس کو الیکٹرانک میکنزم سے زندہ کر دیا جاتا ہے۔ وہ آنکھیں تو کھول لیتا ہے، لیکن مشین کی طرح۔ بالکل مشین کی طرح اٹھ کر بیٹھنے لگتا ہے، تو ٹانکے ٹوٹ جاتے ہیں۔ لہو کے فوارے۔ سب تہس نہس۔

گیٹ پر، ڈیمانسٹریٹروں، کا شور شرابہ۔ جس کو ملکہ کی نظروں سے دور رکھنے کے لئے سپیشل پولیس بلائی گئی۔ پولیس جس وقت نہتے لوگوں کو مار مار کر بھرتہ بنا رہی تھی، تو ساؤتھ ہال میں اس طرح کی بُرائی وار داتوں کی یاد آتی ہے۔

اور آخر میں «جینیس»، کے ایکسپرٹ ڈاکٹر کا ——— جس کو اور سب کچھ سے زیادہ فکر اپنے «امیج»، کا ہے، کیونکہ بی۔ بی سی۔ والے اس کی فلم بنا رہے ہیں ——— لیکچر، انسان کے مستقبل کے بارے۔ بڑے بڑے لفظ، جن کی دہشت میں سب سکڑے بیٹھے ہیں۔

شیبرال کی صرف ایک ہی فلم دکھائی گئی ہے ——— «لے فینتومز دو شیپلئے»۔
شیبرال ——— سینما کا عظیم ماسٹر، جینئس!
شیبرال کی خوبصورتی اس کے فریموں میں ہے۔ ایک ایک فریم، جیسے کسی مہان پینٹر کی پینٹنگ۔

فلم شروع ہوتی ہے، بارش سے۔ شام کا وقت۔ موسلا دھار بارش۔ خالی

اُجاڑ گلیاں۔ بارش میں بھیگتی سڑکوں کی بتیاں روتی ہوئی معلوم ہوتی ہیں۔

اور خالی گلی میں ایک اخبار پڑا ہے۔ گلی کے پتھروں پر بے سہارا۔ بارش میں چُپ چاپ بھیگتا۔

لیوں اور کیشو داس دو درزی ہیں۔ گلی کے آر پار، آمنے سامنے۔ نیچے دکانیں اور اُوپر خود رہتے ہیں۔

لیوں امیر درزی ہے۔ صرف ہیٹ بناتا ہے۔ موٹا، لمبا، تگڑا۔ ایک بڑا کاؤنٹر میں مدد کرنے کے لئے رکھا ہُوا ہے۔ نوکرانی ہے، جو روٹی پکاتی ہے، اس کے بُوٹ اُتارتی ہے، گرم پانی دیتی ہے، اس کی سیوا کرتی ہے۔

کیشو داس غریب درزی ہے۔ کپڑے سیتا ہے۔ بیوی چار بچّے۔

لیوں روٹی کھا کر، روٹی کی ایک ٹرے لے کر اُوپر کے کمرے میں جاتا ہے۔ اپنی بیوی کے لئے، جو پندرہ سال سے پریلیسز سے چارپائی پر پڑی ہے

شام کے وقت جب لیوں سج دھج کر گھر سے کلب جانے کے لئے نکلتا ہے، تو کیشو داس، بے چارہ سا کیشو داس اپنا پرانا کوٹ پہن کر اس کے پیچھے پیچھے جاتا ہے۔ اس کی اس بات میں تسلّی ہے، کہ لیوں اس کی میز پر بیٹھ کر شراب پی لیتا ہے۔ پیسے ہمیشہ کیشو داس دیتا ہے۔

شہر میں سنسنی ہے۔ ایک کے بعد دوسرا، اور دوسرے کے بعد تیسرا، شہر میں چھ قتل ہو چکے ہیں۔ چھ ہی عورتوں کے۔ اور ہر قتل سے پہلے قاتل شہر کے لوکل اخبار کو خط لکھتا ہے۔ "میں نے اب ایک اور قتل کرنا ہے، خبردار رہنا"۔

پولیس پریشان ہے۔ پریس رپورٹر حیران ہیں۔ لیکن قاتل ابھی پکڑا نہیں گیا۔

اور آخر ایک رات کو، کلب سے واپس آتے ہوئے کیشو داس لیوں کو ایک عورت کو قتل کرتے ہوئے دیکھتا ہے۔ حیران تو ہوتا ہی ہے، وہ خوف سے

بیمار بھی ہو جاتا ہے۔

لیوں کی بیوی کا کمرہ۔ وہاں ایک عورت کی ڈمی ہے۔ صرف ایک مینکوئن، جس طرح کی شو ونڈوز میں پڑی ہوتی ہیں۔ اور لیوں اس کے ساتھ باتیں کرتا ہے۔ اس کی پہیوں والی کرسی کو کھڑکی کے نزدیک رکھتا ہے، تاکہ سب سامنے سے دیکھ سکیں، کہ کوئی عورت بیٹھی ہے، پردے کے پیچھے۔ کھانا جو اُوپر لاتا ہے، وُہ خود ہی باتیں کرتے کرتے کھا لیتا ہے۔

فلیش بیک۔ لیوں کی بیوی اپنی بیماری کی وجہ سے بہت دُکھی ہے۔ بے بسی ایک عجیب قسم کی ضد کو جنم دیتی ہے۔ خاوند کے ساتھ لڑائی، جھگڑا۔ اور آخر ایک دن پریشانی کی حد سے پار پہنچ کر وہ اس کا گلا گھونٹ دیتا ہے۔ اور اس کو نیچے، بوری میں ڈال کر گڑھا کھود کر دبا دیتا ہے۔

مصیبت یہ ہے، کہ اس کی سکول کے زمانے کی سات سہیلیاں ہیں، جو ہر سالگرہ پر اس کو مبارک دینے آتی ہیں۔ لیوں نے جب اس کو قتل کیا تھا، اس کے دو ماہ بعد ہی اس کی سالگرہ تھی، اس لئے سات کی سات کو قتل کرنا بھی بہت ضروری تھا۔

لیکن ساتوں کے ختم ہونے کے بعد، جس طرح اس کا خیال تھا، قصّہ ختم نہیں ہُوا۔ پھر یہ قتل کرنے اس کی مجبوری بن گئے۔

یہ سب کچھ وہ کیشو داس کے سامنے قبول کرتا ہے، جب کیشو داس مر رہا ہے۔ اور آخری قتل کے بعد وہ ساری رات لاش کے ساتھ ہی سو رہا۔ صبح پولیس نے اس کو جگایا۔

لیکن فلم میں کہانی ضروری نہیں۔ ضروری اس کا 'سینیمیٹک ٹریٹمنٹ' ہے۔

فرانس کا ایک اور ڈائریکٹر ہے کلاڈ شابرول، جس کی فلمیں 'فارین رپیرٹوریکو'

میں دکھائی جا رہی ہیں۔

یہ بہت سینسٹو ڈائریکٹر ہے۔ اور فلم کا ٹریٹمنٹ بہت موزوں، حساس۔

فلم کی اصل بات ہی احساس کی ہے۔

اس کی ایک فلم دسیکس ایت لے فیر پلیورز۔

بنک میں ڈاکہ۔ ایک آدمی مر گیا ہے، دو زخمی ہوئے ہیں۔ اور پولیس اپنے آپ کو ایک دفعہ اور اکو بنا محسوس کرتی ہے۔ خاص کر ایک پولیس افسر، میک۔ اس کی بے بسی اس کو بے حد پریشان کرتی ہے۔

وہ سوچتا ہے، کسی طرح ایک گینگ پکڑا جائے، تو باقی کو کان ہو جائیں۔

ہمیشہ جب ڈاکہ پڑتا ہے، کار تو چوری کی ہی ہوتی ہے، جس میں ڈاکو آتے ہیں۔

اس کو ایک آدمی کا پتہ ملتا ہے، جو شاید پرانی اور چوری کی کاروں کا دھندہ کرتا ہے۔

اس کے پاس پہنچ کر پتہ چلتا ہے، کہ وہ تو میک کا پرانا ساتھی ہے، جب فوج میں اکھٹے تھے۔

وہ دوست اپنا پتہ دیتا ہے۔

اس علاقے کے انسپکٹر سے پوچھ گچھ پر پتہ لگتا ہے، کہ وہ دوست مجرم نہیں۔

چھوٹے موٹے دھندے کرتا ہے۔ اصل میں کاریں اور پرانا سکریپ، یعنی کاروں کا لوہا خریدنے والا ایک اور آدمی ہے، اور اس کے پاس چھ افراد کام کرتے ہیں۔ سیدھے سادے۔ مگر غریبی کے مارے ہوئے۔

اور ان چھ افراد کی زندگی۔ دن میں کام کرتے ہیں، شام کو بار میں شراب پیتے ہیں، گٹار بجاتے ہیں، ناچتے ہیں، اور گھر چلے جاتے ہیں۔

اس دوست، ایلفی کے ساتھ ایک لڑکی بھی رہتی ہے۔ نہایت خوبصورت، رن۔ جو اس کا گھر بھی چلاتی ہے، اور شام کو اپنا سٹریٹ واکنگ، کا دھندہ کرتی ہے۔

میک، پولیس آفیسر، اس لڑکی کو پک اپ، کر کے لاتا ہے۔ دو سو فرانک

دیتا ہے، اور اس کے ساتھ صرف گپیں مارتا ہے۔

پھر باقاعدہ ایک فلیٹ لے لیتا ہے۔ اس لڑکی کو روز بلا لیتا ہے۔ روپے دیتا ہے۔ اس کے ساتھ تاش کھیلتا ہے۔ اور اس کو کہتا ہے "میں میٹ مارکیٹ برانچ کا بنک مینجر ہوں"۔

آہستہ آہستہ اس کو بتاتا ہے، کہ بدھ وار بنک میں بہت زیادہ پیسے جمع ہوتے ہیں۔ اس لئے بدھ کے دن میں تمہیں نہیں مل سکتا۔

آہستہ آہستہ اس لڑکی کو احساس ہوتا ہے، کہ اگر بدھ وار کو اگر بنک میں ڈاکہ پڑ جائے، تو اس کی اور اس کے ساتھیوں کی زندگی آرام سے کٹ جائے گی۔

کس طرح وہ سیدھے سادے لوگ کریمنل بن جاتے ہیں، اس فلم کی خوبصورتی ہے۔ غریبی اور مشقت میں جیتے، صاف گو لوگوں کو آسانی سے پیسے ملنے کا سپنا دکھا کر کس طرح ان کی ذہنیت بدلی جا سکتی ہے۔ اور بدلنے والا خود وہ پولیس افسر ہے۔ کیونکہ اس کو ایک "ریڈی میڈ" ڈاکہ چاہیئے، جس میں وہ ڈاکوؤں کو گرفتار کر سکے، اور اپنی پرانی بے بسی اور ندامت کو دھو سکے۔

آخر ڈاکہ پڑتا ہے۔ سارے گرفتار ہو جاتے ہیں۔

اور وہ لڑکی ہکّی بکّی ہو کر دیکھتی ہے، اپنے لور کو جو بنک مینجر نہیں تھا، بلکہ پولیس افسر تھا۔

پوچھ گچھ کے لئے اس لڑکی کو، اور کئی لوگوں کو، جو ان ڈاکوؤں کو جانتے تھے۔ ان سے میل ملاپ تھا، گرفتار کر کے لوکل انسپکٹر پولیس تھانے میں بلا لیتا ہے۔

میک کو احساس ہوتا ہے، کہ اس لڑکی کا گرفتار ہونا اس کو گوارا نہیں۔ شائد من کا کوئی رشتہ اس کے ساتھ جڑ گیا تھا۔

لیکن لوکل انسپکٹر جو اپنے آپ کو غلط ثابت کئے جانے پر خفا ہے، اس کو

چھوڑنے کو تیار نہیں۔

میک اس پولیس انسپکٹر کو گولی مار دیتا ہے، اس لڑکی خاطر۔

گرفتار ہو کر، پولیس کی کار میں بیٹھتے وقت، کار کی کھڑکی کے شیشے کے باہر، وہ جرمن لڑکی نظر آتی ہے۔ پگھلی ہوئی، آنکھیں نم، حیران پریشان۔

یہ فلم انسان کے من سے پردے اٹھاتی ہے، ایک ایک کر کے، نقاب اتارتی جاتی ہے، پیاز کے چھلکوں کی طرح۔ اور نیچے ایک آدھ 'فلیش' میں ننگی روح کے درشن ہوتے ہیں۔

نہایت خوبصورت فلم!

اس نویں انٹرنیشنل فلم فیسٹیول کی جیوری کے دو ممبر ہندوستانی ہیں ——
آدور گوپال کرشنن، اور وجنتی مالا بالی۔

آدور کے بارے تو آپ کو پہلے بتا چکی ہوں، اور اس کی فلم 'ایلیپا تھیم' کے بارے بھی۔ وجنتی مالا کو ہندوستان کا کون سا ایسا شخص ہے، جو نہیں جانتا؟ یہ مشہور بھرت ناٹیم ڈانسر سب سے پہلے اپنی تامل فلم 'وزکائی' سے شہرت کی روشنی میں آئی۔ یہ بات ۱۹۵۱-۵۲ کی ہے۔ ہندی فلموں میں بے حد کامیاب ایکٹرس بن کر چمکی۔ اس کی مشہور فلمیں ہیں —— دیوداس، مدھومتی، سنگم، گنگا جمنا اور سادھنا۔ 'سادھنا' کے لئے اس کو فلم فیئر ایوارڈ ملا۔

آج کل بھرت ناٹیم کی مشق کر رہی ہے، اور کئی شاگردوں کو تربیت دے رہی ہے۔

مارگریٹ وان ٹراٹا، پہلی عورت ڈائریکٹر ہے، جس کو وینس فلم فیسٹول میں "گرانڈ پیری" ملا تھا۔ "گرانڈ پیری" کے علاوہ اس کو کئی اور ایوارڈ اور انعام بھی ملے۔

ٹراٹا ان گنے چُنے جرمن فلمکاروں میں سے ہے، جو اپنے نازی ماضی کو نہ شرما کر اور نہ ڈر کر، بلکہ سیدھا آنکھوں میں جھانک کر دیکھنے کی جرأت رکھتے ہیں۔ اور اس گذرے ہوئے بھیانک دور کا غیر جانبدارانہ وِشلیشن کرنے کی دلیری کر رہے ہیں۔

ٹراٹا کے ذہن میں اس کے ملک کی سیاسی اور سماجی مسائل کے بارے بڑے شفاف عکس ہیں۔ اور ان عکسوں کی ترجمانی وہ اپنی فلموں کے ذریعے کرتی ہے۔

نہایت ذہین، حساس اور تراشی ہوئی سوجھ والی یہ عورت کہتی ہے "ہمارے ملک میں نازی ازم کو لوگ ۱۹۵۰ء کے گزشتہ دہائی میں بھول گئے تھے۔ مگر انٹوٹیکچل لوگوں کے ایک گروپ نے اس کے خلاف آواز اُٹھائی۔ اس گروپ میں عورتیں بھی تھیں۔ ان دنوں طالب علم بھی مظاہرے کر رہے تھے۔ مگر ان عورتوں کو باقی سب نے انٹوٹیکچل ماننے سے انکار کر دیا۔ اس لئے ان عورتوں کے گروپ پہلے عورتوں کے ساتھ اس نابرابری کے بارے مظاہرے شروع کئے۔ اور اس صدی کی آٹھویں دہائی میں انہوں نے اتنے برابری کے حق حاصل کر لئے کہ مردوں کے برابر کھڑے ہو کر، بلکہ مردوں سے بھی زیادہ عمدہ فلمیں بنانے لگیں۔ اس وقت جرمنی میں تقریباً چالیس عورتیں فلم ڈائریکٹر ہیں۔

اپنی فلم "جرمن سسٹرز" کے بارے وہ کہتی ہے۔ "پہلے میں نے یہ جرمن ٹیلیویژن کے لئے بنائی تھی۔ مگر جس ڈائریکٹر کے پاس وہ جاتی، وہ اس کو نامنظور کر دیتا۔ آخر ایک ڈائریکٹر چھٹی پر گیا، تو اس کی جگہ پر جو عورت کام کر رہی تھی، اس نے جھٹ پٹ سکرپٹ منظور کیا، اور میں نے فوراً کام شروع کر دیا۔" اور وہ اپنی سنجیدہ مسکراہٹ کے ساتھ چھوٹی سی ہنسی ہنستی ہے۔

وینس فلم فیسٹیول میں جب اس فلم کو سب سے بڑا ایوارڈ "گرانڈ پری" مل گیا، تو فلم جرمنی میں ریلیز ہوئی۔ فلم دیکھ کر لوگوں کو احساس ہوا، کہ آج تک وہ ٹیروریسٹوں کو (یعنی ہندوستان کے نکسل وادیوں کی طرح ٹیروریسٹ) وہ جن نظروں سے دیکھتے رہے تھے، وہ نظریہ ہی شاید دوبارہ وضاحت مانگ رہا تھا۔ پہلی بار یہ احساس ہوا، کہ یہ بم پھینکنے والے لوگ اصل میں قتل و غارت کرنے والے مجرم نہیں ہوتے، بلکہ ایک سپنے کی خاطر اپنا سارا سکھ آرام قربان کر دینے والے عام لوگ ہی ہوتے ہیں۔

نہیں، ہم فلم کار ریفیٹسٹ نہیں ہیں۔ ہمارا کوئی عزم و زم نہیں۔ نہ ہی ہم کمیونسٹ پارٹی کے ممبر ہیں۔ ہم تو موجودہ سوالات کو ایک مختلف نظریے سے پرکھنے کے حق میں ہیں۔ وہ سوالات چاہے سیاسی ہوں، اور چاہے سماجی۔ کیونکہ وہ سوالات آخر کار انسانی زندگی کے ساتھ جڑے ہوئے ہیں۔ ان کو انسانی ڈھنگ سے سوچنے کی ضرورت ہے۔ ہم کلاکار تو صرف ان کا غیر جانبدارانہ وشلیشن کرتے ہیں۔ بس۔

ٹراٹا، اور اس کی اور جرمن فلم کار ساتھی جو فلمیں بناتے ہیں، ان میں ایک بہت لطیف درد اور ہمدردی کا احساس شروع سے آخر تک قائم رہتا ہے۔ خاص کر اس فلم "جرمن سسٹرز" میں۔ عورتوں کی آزادی یعنی "ویمنز لب" کا جھنڈا اٹھا کر نعرہ تو ہر کوئی لگا سکتا ہے، لیکن اصل بات "فیمنزم" نظریہ کی ہے۔ جو ہر انسان کے من میں ہمدردی اور ہمسائیگی کے رشتے پیدا کر سکتی ہے۔ اور کیا یہ رشتے زندگی کا آخری ماحاصل نہیں؟ "جرمن سسٹرز" ٹراٹا کی تیسری فلم ہے۔ اس کی کہانی سچ مچ کے واقعہ پر منحصر ہے، اور "گڈرن اینسلن" کی کہانی ہے، جو "بیدر مائن ہاف گینگ" کی ممبر تھی، اور جو جیل میں ہی مر گئی۔ اور "اتھارٹیز" نے کہا، کہ اس نے خودکشی کر لی تھی۔

یہ دو بہنوں کی کہانی ہے۔ ایک تو اس گینگ کی ممبر ہے، اور دوسری جرنلسٹ۔

جرنلسٹ بہن کا خاوند آرکیٹیکٹ ہے۔ بے حد خوبصورت توازن ان کے رشتے میں ہے۔ محبت، ایک دوسرے کے کام کی طرف پوری ہمدردی، اور عقلمندانہ احترام۔ چھوٹا سا پرسکون گھر۔

لیکن اس گھر کا سکون آہستہ آہستہ ٹوٹتا ہے، جب وہ گینگ کی ممبر بہن کبھی کبھار اپنے ساتھیوں کے ساتھ وہاں آ ٹپکتی ہے، اور بڑے حق کے ساتھ بہن کے گھر پر قبضہ کر لیتی ہے، کبھی دو چار گھنٹوں کے لئے، کبھی ایک آدھ رات کے لئے۔ اور اس کو طعنہ دیتی ہے، کہ وہ کس طرح اپنی نارمل زندگی کو گزار رہی ہے، جبکہ ملک میں اتنی بے انصافی ہے، اور پولیٹیکل طاقت غلط ہاتھوں میں ہے۔

لیکن جرنلسٹ بہن کا اپنا طریقہ ہے، مخالفت کا۔ اپنی قلم کی طاقت کے ساتھ۔

دونوں بہنوں میں رشتے کا یہ تناؤ اپنے پورے کلائمکس پر آتا ہے جب دوسری بہن کا خاوند، تھکا ہارا اپنے بیٹے کو سالی کے حوالے کرنے آتا ہے۔ یہ ابھی چھوٹا سا ہے۔ وہ تو گھر رہتی نہیں۔ میں اس کو سنبھالوں، یا روٹی کماؤں؟ فاقوں کی نوبت آ گئی ہے۔ تم اس کو ایک ماہ کے لئے رکھ لو۔ میں کہیں کام کر کے چار پیسے کماؤں۔

جرنلسٹ بہن کو یہ منظور نہیں۔ میں بھی تو کام کرتی ہوں۔ بچے سنبھالنے کے لئے اگر میرے پاس وقت ہوتا، تو میں اپنا بچہ پیدا نہ کرتی؟

لیکن اس کی ساری مخالفت کے باوجود، وہ اس کو چھوڑ کر چلا جاتا ہے۔ اور اپنے سر میں گولی مار کر مر جاتا ہے۔

بچے کا رول ایک ترکی بچے سمیر جاوید نے کیا ہے۔ بڑی پختہ اور خوبصورت ایکٹنگ۔ بچے کو احساس ہے، کہ وہ خالہ کے گھر کوڑے کی طرح پھینک دیا گیا ہے۔ ماں بہت عرصے سے گھر سے غائب تھی۔ باپ غربت کے ہاتھوں ستایا ہوا شاید اس کے ساتھ

جھنجلاتا رہتا ہوگا۔ اور اب اس اجنبی گھر، جس کے لوگ اس کو رکھنے کو تیار نہیں تھے۔

بہت اُداس بچوں کو دیکھ کلیجہ پر چوٹ لگتی ہے۔

خالہ اگر کبھی کبھار بچّے کے قریب آنے کی کوشش بھی کرتی ہے، تو بچّہ اور بھی دُور ہو جاتا ہے۔

اور آخر کار وہ خود کو آگ لگا کر مرنے کی کوشش کرتا ہے۔

یہ ساری ٹینشن، یہ سارا تناؤ جرنلسٹ بہن اور اس کے خاوند کے رشتے کو آہستہ آہستہ تڑکاتا ہے۔ گھر کا سکون آہستہ آہستہ ٹوٹتا ہے۔

گینگ کی ممبر دوسری بہن قید ہو گئی ہے۔

جرنلسٹ بہن اس کو جیل میں ملنے جاتی ہے۔

جیل کا ماحول کچھ اس طرح کا ہے ـــــ دیواروں کے اندر اور دیواریں، ویران صحن، اُونچی دیواروں سے گھرے، خالی کمرے جن میں میز اور کرسیاں بھی ضرورت سے زیادہ دہشت بھرپور اور بری معلوم ہوتی ہیں۔ جیل کی وارڈنیں، خاموشی، خوف۔ کہ ایک عجیب گھٹن کا احساس ہوتا ہے۔ لگتا ہے، کہ آپ خود ان دیواروں کے پیچھے قید ہوں، اور سانس لینے کے لئے ترس رہے ہوں۔

پہلی ملاقاتوں میں قیدی بہن بہت غصّے میں ہوتی ہے۔ جرنلسٹ بہن بھی ناراض ہے۔ "تم جو ساری دُنیا کا ماحول سدھارنے کے لئے یہاں بیٹھی ہو، جس کو ساری دُنیا کا فکر ہے۔ تم نے اپنے خاوند کو، اپنے پیٹ سے پیدا کئے بچے کو پھینک دیا، تم اُن کو خوشی نہ دے سکی!"

لیکن یہ تناؤ، دونوں کی یہ دُشمنی آہستہ آہستہ پگھلتی جاتی ہے۔ اور قیدی بہن کا غصّہ بھی آہستہ آہستہ ہارتا جاتا ہے۔

دونوں کبھی کبھی اپنے بچپن کی باتیں یاد کرتی ہیں۔ کوئی ایک آدھ چھوٹی موٹی باتیں۔

بچپن میں بھی دونوں میں دوستی نہیں تھی۔ باپ کی، ماں کی محبت دونوں میں سے کسی کو زیادہ ملتی ہے، کسی کو کم، اسی بات کی دونوں میں دشمنی تھی۔ لیکن کسی نہ کسی سطح پر دونوں ہم خیال بھی تھیں۔

یہ سارے چھوٹے اشارے، تماشائیوں کا رشتہ ان دونوں کے ساتھ کچھ اس طرح کا بناتے جاتے ہیں، کچھ اس طرح کی دلوں کی ہمسائیگی دونوں کے ساتھ پیدا ہوتی ہے، کہ وہ آپ کی زندگی کا، آپ کے اپنے دلوں کا حصّہ بنتی جاتی ہیں، آہستہ، آہستہ۔

آخر وہ قیدی بہن جیل میں ہی مر جاتی ہے۔ اور جیل کے لوگ کہتے ہیں، کہ اس نے پھندہ ڈال کر خودکشی کر لی ہے۔

یہ وہ مقام ہے، جہاں پر وہ جرنلسٹ لڑکی اپنی مر چکی بہن کے ساتھ کچھ اس طرح جڑ جاتی ہے، کہ اس کی سب سے زیادہ اہمیت وہی بہن بن جاتی ہے۔

وہ کس طرح مر گئی؟ اس نے کس طرح خودکشی کر لی؟ جو بندہ ساری دنیا کے ساتھ لڑتا ہے، وہ خود ہی اپنے آپ کو قتل کیسے کر سکتا ہے؟ ناممکن!

اس کو لگتا ہے، کہ اس کی بہن کو قتل کیا گیا ہے، مارا گیا ہے۔ اس نے خودکشی نہیں کی۔

اور دن رات وہ صرف اس بات کی کھوج میں لگ جاتی ہے، ثبوت ڈھونڈنے میں، تاکہ ثابت کر سکے، کہ اس کو جیل میں مار دیا گیا ہے۔

یہ وہ مقام ہے، جہاں تماشائی کو اپنے ملک میں ہوتے رہتے اس طرح کے واقعات یاد آنے لگتے ہیں۔ اور وہ اور بھی زیادہ شدت کے ساتھ فلم کے ساتھ اور ان دونوں بہنوں کے ساتھ ہوئے تشدد کے ساتھ جڑتا چلا جاتا ہے۔ بے اختیار۔

جرنلسٹ بہن کپڑے کا ایک پتلا بناتی ہے ــــ پورے انسان جتنا، روئی بھر کر۔ اور اس کو روشندان کی سلاخوں کے ساتھ رسّی باندھ کر لٹکا دیتی ہے، کہ اگر

اس نے پھندہ بنا کر خودکشی کی ہوگی، تو اس طرح کی ہوگی۔

اس کے خاوند کی برداشت سے یہ سب کچھ باہر ہو جاتا ہے۔ اور وہ گھر چھوڑ کر چلا جاتا ہے۔

سات آٹھ سال وہ جرنلسٹ لڑکی اس موت کے ثبوت اکٹھے کرتی رہتی ہے۔ اور آخرکار پورا مسودہ تیار کر لیتی ہے۔ جو یہ ثابت کرتا ہے، کہ اس کی بہن کو قتل کیا گیا تھا۔

لیکن اس رپورٹ کو چھاپنے کے لئے اب کوئی تیار نہیں۔ کیونکہ اخباروں میں تو وہی چھپ سکتا ہے، جس کی "نیوز ویلیو" ہو، آج کی تازہ خبر۔ یہ اتنی پرانی بات لوگ بھول بھلا گئے ہیں، اس کو۔ اب اس کی کیا اہمیت رہ گئی ہے!

اور بہن کا وہ بچہ خالہ سے پوچھتا ہے "میرے سکول کے بچے کہتے ہیں، کہ میری ماں بم پھینکتی تھی۔"

خالہ اس کو اس کی ماں کے بارے سمجھانے کی کوشش کرتی ہے۔

اور وہ اپنی ماں کی تصویر پھاڑ دیتا ہے۔

ایک اور جرمن فلم جو مجھے اچھی لگی، وہ تھی "مین اور دی وال"، رائین ہارڈ ہاف کی ڈائریکٹ کی ہوئی۔

ایک بڑا بے چین نوجوان۔ مشرقی جرمنی سے مغربی جرمنی جانے کے لئے بے چین۔ اس کی بیوی بڑی پریشان ہے، مگر اس کو روک نہیں سکتی۔ کوشش کر کے ہار گئی ہے۔ اور آخر وہ ایک دن اس کی کان کی بالی اتار لیتا ہے "میں اس کو لے چلا ہوں، دوسری تم پہنے رکھو۔ اور میں تمہارے ساتھ وعدہ کرتا ہوں، کہ یہ دونوں بالیاں ایک دن ضرور اکٹھی ہوں گی۔"

اور چلا جاتا ہے:-

لیکن برلن کی درمیانی دیوار کو پھلانگنے کی کوشش کرتے ہوئے پکڑا جاتا ہے، اور قید ہو جاتا ہے۔

اور آخر کسی نہ کسی حیلے بہانے مغربی برلن پہنچ جاتا ہے۔

مغربی برلن کی دُنیا اور ہے۔ رشتے اور طرح کے ہیں۔ اور میاں بیوی بھی آپس میں لڑا کرتے ___ کہ تم نے موٹر اتنے میل چلائی ہے، اور پیٹرول میں نے ڈلوایا تھا ___ پیسے ایک دوسرے کو دے دلا کر سمجھوتہ کر لیتے ہیں۔

زندگی کی رفتار تیز ہے۔ رشتے کھوکھلے۔ انسانی ہمدردی غائب۔

مغربی جرمنی کو وہ لڑکا صرف "مغرب" کہتا ہے! یہ مغرب ہے، ویسٹ! اس کو ایک جرنلسٹ ملتا ہے، جو جرمن نہیں۔ اس لئے اس کے دل میں ابھی ہمدردی قائم ہے۔ دونوں اکٹھے رہنا شروع کر دیتے ہیں۔

مغربی جرمنی کے سرکاری لوگ اس سے مشرقی جرمنی کے بارے پوچھ گچھ کرتے ہیں۔ بھید ڈھونڈنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جاسوسی کے لئے۔

اور اس کو اب مغربی جرمنی میں بھی بے چینی محسوس ہونے لگتی ہے۔ دیوار کے ساتھ اس کی دشمنی ہے۔ اُس کو محسوس ہوتا ہے، کہ سب مصیبتوں کی جڑ یہ دیوار ہے، جس نے اچھے بھلے ہنستے بستے شہر کو تباہ کر کے اس کے دو ٹکڑے کر دیئے ہیں۔

اور وہ اس دیوار کو توڑنے کی کوشش کرتا ہے۔ کبھی اس کو ڈائنامیٹ سے اُڑانے کی کوشش کرتا ہے۔

اور اپنے گھر کے لئے تڑپتا ہے، اپنی بیوی کے لئے جو دوسری طرف ہے۔

آخر ایک دن وہ دیوار پر چڑھ کر دوسری طرف چھلانگ لگا دیتا ہے۔

ریڈیو، ٹیلیویژن اور اخباروں میں خبریں "مغربی طرف "ایک سرپھرا شخص،

پتہ نہیں، نشے کی ترنگ میں، یا پاگل پن کے دورے میں دیوار پر چڑھ گیا، اور دوسری طرف گر پڑا، مشرقی طرف۔ جب اس نے دیوار سے ادھر چھلانگ لگائی، اس کے چہرے پر خوشی کا جلال تھا۔

اور اب مشرقی جرمنی کے جاسوس افسر اس سے مغربی جرمنی کے بارے میں اسی طرح کے سوالات پوچھتے ہیں۔

اور اس طرح وہ خواہ مخواہ جاسوس بن جاتا ہے۔ صرف مشرقی اور مغربی جرمنی والے یہ سمجھتے ہیں، کہ وہ اس کو استعمال کر سکتے ہیں۔

اور اس کا اِدھر اُدھر آنا جانا آسان ہو گیا ہے۔ کوئی پوشیدہ راستہ ہے، جس کے ذریعے دونوں اطراف کے جاسوسی اس کو اِدھر اُدھر گذار دیتے ہیں۔

لیکن دیوار اب بھی اس کے ذہن کو جھنجوڑتی رہتی ہے، تڑپاتی رہتی ہے۔ اور اس کو سپنے آتے ہیں، جس میں اس کی یہ طاقتور خواہش اس کو موسیٰ بنا دیتی ہے، جس کے صرف ہاتھ اُوپر اُٹھانے سے برلن دیوار گھاس کے ڈھیر کی طرح گر رہی ہے۔

آخر ایک مغربی جرمنی کی ایک لڑکی کو اس میں دلچسپی پیدا ہوتی ہے۔ اس کو وہ اور اُکساتی ہے۔ اور آخر ایک دن وہ اس کو ساتھ لے کر مشرقی حصے کی طرف جاتا ہے صرف اس مقصد کے لئے، کہ وہ اس کا پاسپورٹ چُرا کر اپنی بیوی کو اسی پاسپورٹ کے ذریعے مغربی طرف لا سکے۔

بیوی ایک رات کے لئے آ جاتی ہے، اور پھر واپس چلی جاتی ہے۔

آخر ایک دِن شام کے اندھیرے کی چھاتی کو چھیدتی سرچ لائیٹس کی روشنی میں، جو مشرقی اور مغربی دونوں طرف سے اس پر پڑ رہی ہے، وہ دیوار پر چڑھ کر اس پر چلنے لگتا ہے۔ نہ اِدھر نہ اُدھر۔ درمیان میں۔ دیوار پر۔

یہ فلم پہلی نظر سے دیکھنے سے، تو برلن کے درمیان کھینچی گئی دیوار کے خلاف

غم و غصہ کی آواز معلوم ہوتی ہے، لیکن غور کریں، تو اس میں احساس کی کئی تہیں ہیں۔ انسان کی انتہائی بھٹکن۔ اپنے موجودہ حالات کے ساتھ ہمیشہ غیر سمجھوتے کی حالت۔ جد و جہد۔ ہمیشہ کہیں دُور چلے جانے کی بے چینی۔ اس انسان کا سراپ، جو حالات کے ساتھ سمجھوتہ کر کے نہیں جی سکتا۔ ایک عجیب بے چین رُوح کی بھٹکن۔

اور مُلکوں کے پولیٹیکل نظریئے۔ چاہے مغربی ہو، چاہے مشرقی، ہمیشہ اسی فکر میں غلطاں، کہ دوسرا کیا سازش کر رہا ہے۔ ہر سرکاری افسر کا ایک ہی نظریہ، ایک جیسی روٹین سوال، چاہے وہ کسی بھی نظام سے وابستہ ہوں۔

اور اندر کی ایک انوکھی، لاجواب، جادوئی طاقت، جو انسان کو زندہ رہنے کی وسیلت پر یزر ویشن، کا طریقہ سکھاتی ہے۔ ہر حال میں۔

'کلاڈ سلاتے'، جس کی فلمیں 'فارین ریٹرو سپیکٹو' میں دکھائی جا رہی ہیں، کی دو اور خوبصورت فلمیں آپ کے ساتھ مشترک کرنا چاہتی ہوں۔

پہلی تو ہے 'ان ہسٹوریری سمپل'۔ یعنی ایک سیدھی سادی تاریخ۔

یہ سیدھی سادی تاریخ ایک عورت کی ہے، 'ماری' کا، جو اصلی معنوں میں، 'ڈی ایمیسپیڈڈ' عورت ہے۔ بہت خوبصورت، احساس کے ساتھ بھری ہوئی اُلجھی ہوئی، اور 'انڈر پلے' والی ایکٹنگ، بڑھیا فوٹوگرافی۔

ماری اُنتالیس سال کی خوبصورت عورت ہے۔ پہلی شادی سے ایک سولہ سال کا بیٹا، جو چھٹیوں میں گھر آتا ہے۔ اور ماری کا ایک دوست، جس کے ساتھ وہ رہ رہی ہے۔ خود مختار۔ فیکٹری میں اچھی نوکری، ڈیزائننگ کی۔

فلم شروع ہوتی ہے، ڈاکٹر کے کلینک سے۔ ڈاکٹر پوچھتا ہے کہ تمہیں پکا پتہ ہے، کہ بچہ تمہیں نہیں چاہیئے؟ مسکراہٹ سے بھرا، لیکن بہت ہی اُس اور ذمہ دار

جواب 'ہاں'۔ 'لیکن دو ماہ پہلے تم تو اس کے بارے بڑی خوش تھیں'؟ 'ہاں، خوش تھی'۔ 'تمہارے مرد کو پتہ ہے'؟ 'نہیں'۔ 'لیکن کیا تم نے اس سے پوچھ لیا ہے'؟ 'نہیں۔ ..... لیکن میں نے اس سے علیحدگی کا فیصلہ کر لیا ہے'۔ 'اچھا، پھر کل صبح کو آجانا۔ اباریشن پر صرف دس منٹ لگیں گے۔ بعد میں تم آرام سے گھر چلی جانا'۔

اگلا دن۔ گھر۔ ماری آرام کر رہی ہے۔ اس کا بیٹا اُس کو آ کر اپنی گرل فرینڈ کے بارے بتاتا ہے۔ لڑکا جوان ہو رہا ہے۔ لیکن اس سے ماری کو کیا فرق پڑتا ہے؟ ہم سب کی اپنی اپنی زندگی ہے، اور ہم سب نے اپنے اپنے سوالوں کے حل خود ہی تلاش کرنے ہوتے ہیں۔

خط لکھ کر وہ اپنے 'لور' کو دیتی ہے، کہ بس، ہم آج سے اپنے اپنے راستوں پر چلیں گے۔ کوئی رونا دھونا نہیں، ہائے توبہ نہیں۔ اس کو ضرور تکلیف ہوتی ہے، مگر وہ اپنے کام میں اتنا مصروف ہے، کہ بیٹھ کر رونے کے لئے اس کے پاس بھی وقت نہیں۔

'تمہاری زندگی میں کوئی اور آگیا ہے'؟ اس کا دوست پوچھتا ہے۔

'نہیں، وہ ہنستی ہے۔ 'بس، اب میں آزاد ہوں'۔

عورتوں کی آزادی کا جو مطلب عموماً لیا جاتا ہے، کہ اس آزادی کا مطلب ہے، مردوں سے آزادی، اس کا یہ فلم بڑے سلجھے ہوئے طریقے سے اس کا وشلیشن کرتی ہے، اور تردید بھی۔ آزادی کا مطلب یہ نہیں، کہ مردوں سے دُور رہو، یا مردوں کے خلاف بغاوت کرو۔ مرد تو عورت کی زندگی کو مکمل کرتا ہے۔ اور عورت مرد کے رشتے میں وہی ساری خوبصورتی ہے، ساری جدوجہد ہے، ساری محنت ہے، ساری وِانوالومنٹ ہے، جو کسی بھی دوستی کے رشتے میں، یا کسی بھی انسانی رشتے میں ہونی لازمی ہے۔ ہر رشتے کی طرح اس میں بھی تکلیف کے جُز بھی ہیں، خوشی کے بھی۔ اور ایک اور چیز بھی ہے، سیکس۔ نہایت ضروری، لیکن اصل بات یہ ہے، کہ رشتہ

کتنی دیر تک من کو اور روح کو رزش کرتا ہے، کتنی دیر وُل فلیمنٹ، دیتا ہے جب یہ سب ختم ہو جائے، تو رشتہ باسی ہونے لگتا ہے، سڑنے لگتا ہے۔ بدبُو کو روح میں سنبھال رکھنے سے تو اچھا ہے، کہ نجات حاصل کر لی جائے۔ اور زندگی کے اگلے امکانات کا انتظار کیا جائے۔

یہ حقیقی آزادی ہے۔ اصل دائمینسی پیشن، عورت کی۔ باقی سب نعرے بازی ہے اور اس آزادی میں یہ بھی شامل ہے، کہ اس کا جسم اس کی اپنی ویپرا پرٹی، ہے، کسی اور کی جائیداد نہیں۔ اس کو وہ جس طرح چاہے، استعمال کرے۔ اور اس میں سے ہی پیدا ہوتا ہے، بچے پیدا کرنے کا سوال۔ بچہ کب پیدا کرے، کس طرح پیدا کرے، اور کس مرد کا پیدا ـــــ اس فیصلے کی آزادی، اس آزادی کا بڑا اہم نکتہ ہے۔

اور اس فلم کی ماری کی کہانی ـــــ ارادی یا غیر ارادی ـــــ اسی آزادی کی ہے، جو ایک دفعہ بھی الفاظ میں نہیں کہی گئی، بلکہ سیدھی سادی زندگی بسر کرنے میں سے پُتے سیدھ پیدا ہوتی ہے۔ یہ آپ مُہار اپن ہی فلم کی خوبصورتی ہے۔

ماری زندگی سے پُوری طرح جڑی ہوئی ہے۔ اس کو اپنے کام سے عشق ہے۔ اپنے آس پاس کے لوگوں کے دکھ درد میں خوشی میں، غربت میں، کام میں، نوکری سے نکالے جانے میں، سب میں اس کی پُوری دلچسپی ہے، اور وہ پُورا حصّہ لیتی ہے۔

اور پھر اس کو ملتا ہے، اس کا پُرانا خاوند، اپنے بیٹے کا باپ۔ جس کے ساتھ ایک دفعہ پھر من کا رشتہ جڑ جاتا ہے۔ دونوں پُرانی باتیں یاد کرتے ہیں، کہ اس وقت بڑے دامپچور ڈ، تھے، اسی لئے جھگڑے ہوتے تھے۔

اور اب اُن کا رشتہ سلجھا ہوا ہے۔

لیکن اب اس کا پُرانا خاوند ایک جوان لڑکی کے ساتھ رہ رہا ہے، جو ایم۔ اے

سر رہی ہے۔ مگر جب وہ لڑکی باہر گئی ہو، تو دونوں اُس گھر میں آجاتے ہیں، جو کبھی اُن دونوں کا گھر ہوتا تھا، اور پیار کرتے ہیں، چوری چوری۔

کچھ دیر کے بعد ماری پھر حاملہ ہو جاتی ہے۔ بہت خوش ہے۔ ڈاکٹروں نے ابھی تصدیق کی ہے۔ سوچتی ہے، کہ بھاگتی ہوئی جا کر اپنے پُرانے خاوند کو بتائے۔

مگر خاوند اس کو بتاتا ہے، کہ اس کی تبدیلی کسی اور شہر میں ہو گئی ہے، اور وہ لڑکی 'لارا'، جو اس کے ساتھ رہ رہی ہے، سب کچھ چھوڑ کر اس کے ساتھ جا رہی ہے۔

تو وہ اس کو کچھ نہیں بتاتی۔ بچّے کے بارے بھی نہیں۔ کیونکہ یہ اس کا نجی معاملہ ہے۔ ہاں، اگر وہ دوبارہ اکٹھے رہنے لگتے، رشتہ قایم رہتا۔ تو وہ اپنی اس خوشی میں اس کو ضرور شامل کرتی۔

وُہ ڈاکٹر جو اس کی دوست ہے، اس سے پُوچھتی ہے 'اب وُہ تو شہر سے جا ہی رہا ہے، تم اس بچّے کو رکھنا چاہو گی، کہ ابارشن ....؟'

'نہیں، اس کو میں رکھوں گی۔ کیونکہ، کون کہہ سکتا ہے، کون کس کو رکھتا ہے! یہ بچّہ بھی تو مجھے اُداس ہونے سے بچائے گا۔ یہ بھی تو مجھے رکھے گا؛'

بہت خوبصورت فلم۔

اور 'کلاڈ ساتے' کی دوسری فلم ہے 'اون پوسیس فلز'، اس کا مطلب ہے 'بُرا بیٹا'۔

یہ کہانی ہے، ایک بیٹے کی اس کے باپ کے ساتھ رشتے کی۔ بیٹا سات سال پہلے امریکہ چلا گیا تھا۔ ایک ہی بیٹا تھا۔ اس لئے آوارہ ہو گیا تھا۔ نشیلی دوائیں کھانے لگا تھا۔ 'ڈرگز'۔ امریکہ جا کر بھی 'ڈرگز' کے دھندے میں گرفتار ہو گیا۔ پانچ سال جیل میں رہا۔ جیل سے رہا ہو کر سیدھا گھر آیا، فرانس۔

لیکن اس کی جیل کی تاریخ اس کے ساتھ چل رہی ہے۔ پولیس اس کو ایئر پورٹ

پر ہی وارننگ دیتی ہے، کہ اس کو ہر ہفتہ آکر رپورٹ کرنا ہوگی۔ اور ڈرگز روگوں سے ساتھ رابطہ رکھنے والی ایک سوشل آرگنائزیشن کے پاس جا کر بھی گفتگو کرنا ہوگی۔

گھر جاتا ہے۔ باپ۔ سخت چہرہ، خاموش، ماتھے پر تیوریاں۔ صبح سویرے کا وقت۔ وہ جلدی سے تیار ہو کر کام پر جا رہا ہے۔ یہ کافی ہے۔ پی لینا۔ یہ فلیٹ کی چابیاں۔ شام کو ملیں گے۔

خالی گھر میں وہ سویا رہتا ہے۔

ماں اس کے بعد ہی مر گئی تھی۔ وہ ماں کی کوئی نشانی، کوئی تصویر ڈھونڈنے کی کوشش کرتا ہے۔

رات کو دونوں بات کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ "تم نے خط لکھنا کیوں بند کر دیا تھا؟ تمہاری ماں تمہارا انتظار کرتے کرتے مر گئی۔ تمہاری لاپرواہی نے ہی اسے جینے سے انکار کر دیا تھا۔ اکیلی گھر بیٹھی سوچتی رہتی تھی۔ آخری دن اس کی سہیلی ایڈلین نے اس کو سیڑھیوں کے پاس مرا پایا!"

پھر بیٹے کو نوکری مل گئی، ایک کتابوں کی دوکان پر۔ وہاں ایک اور لڑکی بھی ہے، جو پہلے ڈرگز لیا کرتی تھی۔

اور پھر ایک دن جھگڑا۔ ایک بار میں بیٹھے شراب پی رہے تھے۔ پہلی بار بیٹے کو اس کے برابر ہونے کا احساس ہوتا ہے۔ شاید شراب سے من کی کھلتی گانٹھوں کا اثر ہے، کہ وہ دو لڑکیوں کو بلا لیتا ہے، اپنے باپ کو کہتا ہے "دونوں ہی ہم کو کنسیشن دے دیں گی، کیونکہ دو گاہک ان کو اکٹھے مل رہے ہیں۔"

باپ غصہ سے بھرا اٹھ کر چل دیتا ہے "تمہیں شرم نہیں آتی؟ ماں کو تم نے اپنی لاپرواہی سے مار دیا۔ اور اب مجھ کو کنسیشنل 'ٹک،' کے کر دے رہے ہو؟"

ایک پل جو باپ بیٹے کے درمیان بن رہا تھا، وہ ٹوٹ جاتا ہے۔

کتابوں والی دکان کا مالک، بزرگ، ذہین، سکالر، اُن دونوں کو، لڑکے کو اور اس لڑکی کو اپنے بچوں کی طرح رکھتا ہے۔ اور دونوں کی باپ کی طرح وہ اپنی ذمہ داری سمجھتا ہے۔

دونوں لڑکا لڑکی اکھٹے رہنے لگتے ہیں۔ وہ لڑکی ابھی پوری طرح ڈرگز کو چھوڑ نہیں سکی۔ کبھی کبھی اپنے بازو میں مارفیے کا ٹیکہ لگواتی ہے۔

زندگی رواں دواں چلنے لگتی ہے۔

اور تب ہی باپ کا ایکسیڈنٹ ہو جاتا ہے۔ وہ بیٹے کو خبر نہیں دیتا۔ کیونکہ بیٹے کے ساتھ ایک اور بھی دھم دھڑاکے کا جھگڑا ہو گیا تھا، جب ایک دن وہ اچانک گھر چلا گیا، تو دیکھا، کہ اس کا باپ اس کی ماں کی سہیلی کے ساتھ بستر میں پڑا ہے۔ اور پھر دونوں اقبال کرتے ہیں، کہ وہ دونوں بڑے عرصے سے اکھٹے رہ رہے ہیں۔ شائد اس کی ماں کی موت سے بھی پہلے سے۔

بیٹا تلملا اُٹھتا ہے "تم تو مجھے اس دن کہتے تھے، کہ میں نے ماں کو مار دیا؟ قاتل تو تم ہو"۔

تو، دونوں کو لگا، کہ رشتہ ختم۔

لیکن، اب ایکسیڈنٹ کے بعد وہ باپ کو ملنے جانا چاہتا ہے، لیکن اس کو معلوم ہوا، کہ اس کے باپ نے ہسپتال کے فارم میں بھرا تھا، کہ وہ کنوارہ ہے۔ اس کا کوئی نہیں۔

اس بات کا دھکا اتنا زبردست تھا، کہ وہ اپنے آپ کو مارفیا کا ٹیکہ لگا لیتا ہے۔ اور وہ لڑکی بھی۔ اور دونوں دو دن سوئے رہتے ہیں۔

کتابوں کی دکان کا مالک ڈھونڈتا ہوا آتا ہے "تم کو آخر کونسی ایسی مصیبت ہے، جو باقی لوگوں نے کبھی دیکھی؟ 'آؤٹ'، ہونا چاہتے ہو، تو لگاؤ نہ کھڑکی سے چھلانگ۔

ویسی وا کوٹ، ہوتا ہے۔ بُزدل! کاہل! مجھے ہی دیکھو، سو مصیبتیں ہیں۔ اکیلا ہوں، دکان میں نقصان ہو رہا ہے، ٹیکس والے تنگ کر رہے ہیں۔ میں بھی ہوتا ہوں، واکوٹ۔؟ لاؤ ٹیکہ میرے لئے بھی!

اور اس مہربان بزرگ کی مہربانی، یعنی جھڑکیاں دے کر بنائی گئی اپنائیت کی مہربانی میں بھیگ کر وہ باپ کی خبر لینے جاتا ہے۔

اب دونوں میں پھر ہمدردی اور دوستی کا رشتہ قائم ہو جاتا ہے، آہستہ آہستہ۔

ٹینڈر مرسیز، یعنی کومل مہربانیاں، امریکن فلم ہے، بروس بیرس فورڈ کی ڈائریکٹ کی ہوئی۔ رابرٹ ڈوول نے اس کو دوسرے پروڈیوسر کے ساتھ مل کر بنایا ہے، اور ڈوول ہی اس کا ایکٹر ہے۔

ڈوول ایک گوّیے کا رول کرتا ہے۔ خود ہی گیت لکھتا ہے، خود ہی گاتا ہے۔ ٹیکساس میں۔ آج کل، جب اس کی بیوی اس کی لڑکی کو لے کر علیحدہ ہو چکی ہے، اِدھ بھٹکتا ہوا، اُجاڑ ویران جگہ پر بنے ایک پٹرول پمپ پر آ نکلتا ہے، جس کو ایک ایک عورت چلاتی ہے، اور وہاں اپنے بیٹے کے ساتھ رہتی ہے۔ دس بارہ سال کا لڑکا، خاموش، اپنے باپ کے بارے کبھی کبھی پوچھتا ہے، اپنی ماں سے "وہ فوج میں تھا۔ مر گیا۔ اگر زندہ ہوتا، تو بہت خوش ہوتا، کہ تم جیسا نیک اس کا بیٹا ہے۔"

گویا، پٹرول پمپ پر بنے کمروں میں سے ایک میں رہتا ہے۔ دن رات پیتا رہتا۔ دو چار دن میں ہی پیسے ختم ہو جاتے ہیں۔ اور پھر وہ پٹرول پمپ پر ہی نوکری کرنے لگا۔

اور آہستہ آہستہ یہ دونوں اکیلے لوگ جُڑتے گئے، ایک دوسرے کے ساتھ

پہلے تو نہیں، مگر بعد میں آہستہ آہستہ وہ چھوٹا لڑکا گوّیے کا دوست بن گیا۔

گوّیے کی پہلی بیوی بھی، کانسرٹوں، کلبوں اور سٹیج پر گاتی ہے، اور کافی مشہور ہے۔

ایک دفعہ وہ اپنی لڑکی کو ملنے جاتا ہے۔ مگر اس کی بیوی جو اپنی مقبولیت اور مشہوری کے نشے میں ہے، اس کو بے عزت کر کے نکال دیتی ہے۔

گوّیے کے کچھ دفین، گانے والے لڑکے اس کو ڈھونڈتے ہوئے آتے ہیں، اور ایک دفعہ وہ پھر اپنی پرانی زندگی کی طرف مڑنے لگتا ہے۔ اس کے ریکارڈ بن رہے ہیں، نئے گیت وہ لکھ رہا ہے۔

اور اس کی لڑکی اس کو ملنے آتی ہے، بڑے سالوں کے بعد۔ دونوں کے درمیان بہت سی خاموشی ہے۔ کہتی ہے 'ایک لڑکا مجھے اچھا لگتا ہے۔ ماں نہیں مانتی۔ میں اس کو لا کر آپ کو دکھاؤں؟' اور جاتے وقت کہتی ہے 'جب میں چھوٹی ہوا کرتی تھی، تو تم مجھے سفید گگھی کا گیت سنایا کرتے تھے۔ یاد ہے'؟۔ وہ کہتا ہے 'نہیں، مجھے تو یاد نہیں'۔ اور بیٹی کے جانے کے بعد بہت اُداس، کھڑکی کے پاس کھڑا، اکیلا، وہ وہی گیت گاتا ہے۔ سفید فاختہ کا گیت۔

اور تب ہی لڑکی ایک ایکسیڈنٹ میں مر جاتی ہے۔

بہت ٹوٹا ہوا، غم میں ڈوبا، وہ اپنی بیٹی کو آخری پیار کرنے جاتا ہے۔

واپس آ کر بہت اُداس، وہ بوٹی ہوئی سبزیوں کی گوڈی کرنے لگتا ہے۔ تو وہ چھوٹا لڑکا بال لے کر آ جاتا ہے 'لو، کیچ کرو، ادھر دو میرا گیند'۔ اور وہ اس لڑکے کے ساتھ گیند کھیلنے لگتا ہے۔

دُور دُور تک پھیلے اُجاڑ ویرانے میں درد کے رشتے والے یہ لوگ سفید فاختہ کی طرح معلوم ہوتے ہیں۔

"آرڈنری پیپل" یعنی "عام لوگ"، امریکن فلم، نفیس، خوبصورت۔

رابرٹ ریڈفورڈ، جو خود ایک مشہور و معروف ایکٹر ہے، کو اس فلم کی ڈائریکشن کے لئے "آسکر ایوارڈ" مل چکا ہے۔ یہ فلم ۱۹۸۱ء کی بہترین فلم کہی گئی ہے، اور اس کے لئے بھی "آسکر ایوارڈ" جیت چکی ہے۔

یہ ایک درمیانے طبقے کے امریکی گھر کی کہانی ہے۔ ایک بیٹا ہے، جو عمر کے خطرناک دور سے گزر رہا ہے ___ یعنی چودہ پندرہ برس کی عمر۔ ٹموتھی ہٹن، نے اس لڑکے کا کردار بڑی کامیابی سے نبھایا ہے۔

یہ بچّہ بے حد حساس ہے۔ اس کے مَن کی اُلجھنیں اس کو بے حد اُداس رکھتی ہیں۔ سائیکی ایٹرسٹ کے پاس بھی لے جاتے ہیں، اس کے ماں باپ۔ علاج سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ لڑکیاں بھی قریب آنے کی کوشش کرتی ہیں، کیونکہ اس عمر سے نارمل، لڑکے لڑکیاں مغربی سماج میں زندگی کے زیادہ لمحات اکٹھے گزارنا شروع کر دیتے ہیں۔ مگر اس کے مَن کی اُداسی، اس کی سوچ میں پڑی الجھنیں، اس کو نہ کسی لڑکی کے قریب ہونے دیتی ہیں، نہ کسی دوست کے، اور نہ ہی ماں باپ کے۔

اس کی اس بیماری کی وجہ سے ماں باپ پریشان ہیں۔ گھر میں لگاتار تناؤ۔ لڑائی، جھگڑے۔ اتنی گھٹن ہے، کہ سانس لینا مشکل ہے۔ یہ ایک "وِشیاس سرکل" ہے۔ ایک چکر، ایک موت کا کنواں۔ جس میں سے نجات کا راستہ نظر نہیں آتا۔

اور اس بچّے کے مَن کی اُلجھنوں کا وِشلیشن کرتی، فلم ہم کو اس مقام پر لے جاتی ہے، جہاں یہ لڑکا، اور اس کا بھائی، ایک کشتی میں بیٹھے ہیں، کشتی پانی کے بھنور میں پھنس گئی ہے، دونوں ڈوبنے لگتے ہیں۔ یہ کشتی کو ہاتھ ڈالے رکھتا ہے۔

لیکن اس کا بھائی چیختا ہوا، موت کی بھیانک چیخ، موت کی بھی نہیں۔ موت کی بھی نہیں، موت کے خوف کی کرلاتی ہوئی چیخ میں گھرا، تڑپتا ہوا ڈوب رہا ہے۔

یہ لڑکا کشتی کو ہاتھ سے نہیں چھوڑتا، ڈوبتے ہوئے بھائی کو بچانے کی کوشش نہیں کرتا۔ موت کے اسی خوف کے زیرِ اثر وہ بس کشتی کے کنارے کو مضبوطی سے پکڑ کر اپنے آپ کو ڈوبنے سے بچانے کی کوشش کرتا ہے، بس۔ اور اس کے دیکھتے ہی دیکھتے بھائی ڈوب جاتا ہے۔

اور اس کے بعد اس کو ہمیشہ یہ محسوس ہوتا ہے، کہ اپنے بھائی کی موت کے لئے وہ خود ذمہ دار ہے۔

بھائی تو پانی کے بھنور میں ڈوب کر آزاد ہو گیا۔ لیکن یہ بچہ اپنے من کے بھنور میں لگاتار ڈوب رہا ہے، دن رات۔

اور اس بھنور میں پھنسے اس کے ماں باپ، اپنی عام زندگیاں، بسر کئے جا رہے ہیں۔ اور درد کے پانیوں میں دن رات ڈوب رہے ہیں۔

خوبصورت، سینسیٹو ایکٹنگ۔ مگر کہیں بھی سینسٹوٹی، کی دہلیز پار کر کے، وسینٹیمنٹل، نہیں ہوتی۔ یہ زندگی ہے، ان لوگوں کی۔ درد کے بھنور ہیں، جن میں یہ لوگ پھنسے ہوئے ہیں۔ مگر درد کے بھنوروں میں کون نہیں پھنسا ہوا؟ یہ درد ہی عام لوگوں کا ما حاصل ہے۔ یہ درد ہی انسانی زندگی کا ما حاصل ہے، یہی اس فلم کا پیغام معلوم ہوتا ہے۔

امریکہ کی ہی ایک اور نہایت خوبصورت فلم ہے ’’آن گولڈن پانڈ،‘‘ یعنی ’’سُنہری جوہڑ پر‘‘

ہینری فانڈا کی اور کیتھرین ہیپ برن کی کمال کی ایکٹنگ۔ بہت ہی پیاری فلم۔ فلم کا ایک ایک شاٹ، خاموش، سنبھلا ہوا، گھمبیر شاٹ، آپ کے کلیجے سے آہستہ آہستہ کچھ کھرچتا ہوا چلا جاتا ہے۔

دو بہت بزرگ مرد عورت، اپنے دکنٹری ہاؤس، میں، جو ایک جھیل کے کنارے بنا ہوا ہے۔ لگ بھگ جھیل کے ساتھ گھرا ہوا۔ مرد بہت سنجیدہ، خاموش اور کہیں اندر سے، روح کی گہرائی میں سے، بہت اُداس۔ صحت بھی اس کی اچھی نہیں۔ اس لئے اس کی بیوی کو اپنے اندر سے بہت ساری طاقت، اور روشنی اور خوشی پیدا کرنا پڑتی ہے، تا کہ وہ ان دونوں کے زندہ رہنے کے لئے کافی ہو۔ دونوں کی ایک بیٹی ہے، جو چالیس کی عمر کو پہنچ رہی ہے۔ شہر میں علیحدہ رہتی ہے۔ اور اپنی زندگی کو اپنی مرضی سے بسر کرتی ہے۔ اس کی یہ مرضی، باپ کو پسند نہیں۔ اس لئے باپ بیٹی کی آپس میں بنتی نہیں۔

اس رشتے کا توازن قایم رکھنے کے لئے ماں کو ہی کوشش کرنی پڑتی ہے۔ بیٹی کے کردار میں ہے، ہینری فانڈا کی حقیقی بیٹی، جین فانڈا۔

رشتوں کا یہ نازک توازن اور بھی ڈول گیا، جب ایک دن بیٹی ان کے پاس اپنے ملور، کو لے کر آئی، اور ساتھ دلور، کا دس سال کا بیٹا۔ وہ اپنے مرد کے ساتھ چھٹیاں گزارنے کے لئے جانا چاہتی ہے، اور اس کے بچے کو اپنے ماں باپ کے پاس چھوڑنا چاہتی ہے، تا کہ دونوں آزادی سے گھوم سکیں۔

یہ دسپچوئیشن، باپ کو بالکل گوارا نہیں۔ اپنے گھر کی خاموشی میں، چین اور سکون میں، وہ کیوں یہ فالتو کی مصیبت کو داخل ہونے دے؟ کیوں اپنا چین تباہ کرے؟ اور یا اللہ، بچہ بھی بیٹی کے عاشق کا۔

مگر ماں بچے کو رکھنے کے لئے راضی ہو جاتی ہے۔

اور اس کے بعد، کس طرح اس بچے کے ساتھ وہ بزرگ زندگی کے معنی اور زندگی کا رومانس پھر تلاش کرتا ہے۔ یہ سب کچھ اتنی باریک بینی سے فلمایا گیا ہے، اس فلم میں، کہ اس فلم میں سے گزرنا کسی ماسٹر آرٹسٹ کی گیلری میں

سے گزرنے کی طرح، یا کسی بڑے مقدس مقام کی یاترا کی طرح روح سے راستوں کی دھول کو صاف کرنے جیسا 'ایکسپیریئنس' ہے۔

نہایت خوبصورت جادوئی فلم!

جرمنی کی 'ٹراٹا' کے علاوہ ایک اور عورت ڈائریکٹر ہے، بلغاریہ کی، ڈائریکٹر 'ینا ایکیتیشوا' جس کی فلم 'دائیو لالاینخ' یعنی 'برف کا طوفان' بڑی بڑھیا فلم ہے۔

دراصل جب عورتیں فلموں کو ڈائریکٹ کرتی ہیں، تو فلم میں ایک اور 'ڈائمینشن' جڑتی ہے۔ ایک کچھ ایسا ہوتا ہے، کچھ ٹھہراؤ، کچھ متحرک، کچھ شاعری، کچھ سنگیت، جو اس بات کی حامی بھرتا ہے، کہ اس کو کسی عورت کی جذباتی اور 'سینسٹو' انگلیوں نے اور من نے چھوا ہے۔

اس فلم کی ایک اور خاصیت یہ ہے، کہ یہ بلغاریہ کی مشہور ناولسٹ 'بلاگا دیمتوروا' کے ناول پر مبنی ہے۔ بلاگا شاعری بھی کرتی ہے۔ اور اس کی کئی نظموں کا ترجمہ امرتا پریتم نے پنجابی میں کیا ہے۔

پہاڑیوں کا یعنی 'ماؤنٹینیرز' کا ایک قافلہ پہاڑ پر چڑھ رہا ہے۔ چوٹی پر جا کر انہوں نے جھنڈا گاڑنا ہے۔ اور واپس مڑ آنا ہے۔

راستے میں برف کا زبردست طوفان آتا ہے۔ پہاڑوں پر پڑی برف تڑکنے لگتی ہے، اور پھر منوں کے حساب سے برف پہاڑوں سے نیچے لڑھکنے لگتی ہے۔ ایسے معلوم ہوتا ہے، جیسے پورے کے پورے پہاڑ ہی پگھل کر نیچے لڑھکتے آ رہے ہوں۔

اور یہ سارا گروپ جس میں ایک لڑکی بھی ہے 'دارا'، اس طوفان میں پھنس جاتا ہے، سب کے سب لوگ۔ گیند کی طرح ہوا میں اڑتے، لڑھکتے۔

ہر بندے کو مرنے سے پہلے اپنی زندگی کے اہم یا عام واقعات یاد آتے ہیں۔

ماں کا بنا کیک، محبوبہ کے ساتھ کوئی ملاقات، کوئی سپنا، جو توں کا گم ہونا ــــ عجیب و غریب باتیں۔ ایک آدھ فلیش! عجیب!

اور موت!

جو بھی بچ گئے، ہیلی کاپٹروں کے ذریعے 'ریسکیو' کر لئے گئے۔ ان میں سے کسی کی ٹانگیں جم کر بیکار ہو گئی تھیں، کاٹ دی گئیں۔ کوئی پاگل ہو گیا۔ دارا کے ہاتھوں کی انگلیاں کاٹنا پڑی ہیں۔

فلم کی خاص خوبصورتی اس کی فوٹوگرافی میں ہے۔ خاص کر برف کے طوفان کی فوٹوگرافی میں۔ اور سارے 'ٹریٹمینٹ' میں۔

پولینڈ کی فلم 'دی کوٹیک'، جبرزی ہاف من کی ڈائریکٹ کی ہوئی، اچھی فلم ہے۔ چاہے اس کی کہانی کچھ کچھ ہندی فلموں کے ساتھ ملتی ہے ـــ ایک کامیاب 'سرجن' بہت ہی مشہور و معروف۔ اس کی بیوی اپنی بچی کو ساتھ لے کر کسی اور کے ساتھ چلی گئی۔ اس صدمے کی وجہ سے، شراب پی پی کر جھلا ہو گیا سرجن۔ راستے میں غنڈوں نے لوٹ کر کوڑے کے ڈھیر میں پھینک دیا۔ صدمے سے اور مار سے اس کی یادداشت ختم ہو گئی۔

وہ گاؤں گاؤں گھومتا رہا۔

پندرہ سال کے بعد ....

پھٹے کپڑے۔ بڑھی ہوئی داڑھی، سفید۔ پاؤں سے ننگا۔ فقیرانہ وضع قطع۔ ایک گاؤں میں کام ڈھونڈتا ہے، ایک کسان کے ساتھ۔

کسان کا بیٹا پانچ ماہ پہلے سیڑھی سے گر گیا تھا۔ دونوں ٹانگیں بیکار ہیں، اور وہ خودکشی کرنا چاہتا ہے۔

اس جوان لڑکے کو روتا دیکھ کر سرجن کے اندر سے کچھ جاگتا ہے، اور وہ لڑکے کا چاقو سے، ہتھوڑے سے، سوئے سے، یعنی کھیتی کے کام میں استعمال ہونے والے اوزاروں سے اپریشن کر کے، ہڈی توڑ کر، دوبارہ جوڑ کر، ماس سی کر، اس کو تندرست کر دیتا ہے۔

اور پھر قریبی دیہات سے بھی سینکڑوں لوگ اس کے پاس علاج کرانے کے لئے آنے لگتے ہیں۔

قریبی دیہات کے ڈاکٹروں کی پریکٹس ختم ہو گئی۔ اور وہ سب مل کر اس، دکوٹیک، یعنی ہرڑ پوپو کو ختم کرنے کے منصوبے بنانے لگتے ہیں۔

اتنی دیر میں اس کو اپنی گمشدہ لڑکی مل گئی۔ اور اس کی یادداشت پلٹ آئی۔ لیکن کسی کو بتاتا نہیں۔ وہ زندگی چھوڑ کر، وہ بے چارے مجبور غریبوں کا علاج چھوڑ کر اس کو کہیں جانا منظور نہیں۔

لیکن ڈاکٹروں نے مقدمہ کر دیا۔ اور کچہری میں کسی نے اس کو پہچان لیا۔

کہانی کو چھوڑیں۔ ہیرو کی ایکٹنگ اتنی عمدہ ہے، کہ ہمارے اپنے دلیپ کمار سے ملتی ہے۔

معلوم ہوتا ہے، کہ شائد بہترین ایکٹر کا ایوارڈ اسی پولش ایکٹر کو مل جائے۔

گیارھواں انٹرنیشنل فلمی میلہ

دہلی میں آج کل فلمی میلے کی چہل پہل ہے۔ لیکن اتنی نہیں، جتنی پہلے میلوں کے وقت ہوا کرتی تھی۔

مجھے یاد ہے، جب پہلا فلمی میلہ ہوا تھا، تو پوری دہلی کو ہی نہیں، پورے ملک کے فلم دوستوں کو جیسے بخار سا چڑھ گیا تھا۔ پورے ملک سے لوگ میلہ دیکھنے آئے تھے۔ جن سنیماؤں میں میلہ لگ رہا تھا، لوگ گھنٹوں سے قطاریں باندھ کر ٹکٹیں لینے کے لئے کھڑے رہتے تھے۔ اور ٹکٹیں بھی تاش کے بلائنڈ کھیلنے جیسی ہوتی تھیں۔ پورے ہفتہ بھر کی ٹکٹیں، کسی بھی شو کی خرید لیں، اور مداری کی پٹاری میں سے کیا کیا نکلتا ہے، اس کا انتظار کرتے رہیں۔

لیکن یہ گیارہویں انٹرنیشنل میلے تک پہنچتے پہنچتے انتظام کرنے والے لوگ بھی سیانے ہو گئے ہیں، اور فلمیں دیکھنے والے لوگ بھی۔

لیکن زیادہ لوگ اب بھی یہی سمجھتے ہیں، کہ فلم میلے کا مطلب ہے، کہ ولائتی فلمیں جن میں، گرما گرم سین ہوں سینسر کی قینچی کی قتل گاہ سے گزرے بغیر ہی یہ فلمیں دیکھنے کو ملتی ہیں، یہی سوچ کر زیادہ لوگ فلم دیکھنے جاتے ہیں۔ تارکووسکی، جس کا گزشتہ دنوں انتقال ہو گیا ہے، نے دنیا بھر کے سنیماؤں کو اپنی فلموں سے ہلا کر رکھ دیا۔ لیکن جب ارچنا سنیما میں ایک فلم میلے کے دوران اس کی فلم دکھا کر، دکھائی

جارہی تھی، تو لوگوں نے ہال کے شیشے توڑ دیئے، کیونکہ فلم میں گرم سین نہیں تھے۔ سینما والوں کو وہ فلم درمیان میں ہی بند کر کے دوسری فلم چلانا پڑی تھی۔

خیر، اس دفعہ تو میلے کی ولائیتی فلموں کی بات میں آپ سے پھر کبھی کروں گی۔ اب میں دو عمدہ ہندی فلموں کی بات بتاتی ہوں۔

....

پہلی فلم ہے، کیتن مہرہ کی "مرچ مصالحہ"، جو ہے، تو کمرشل فلم ہی، مگر آرٹ سینما کی ساری خوبیاں اس میں موجود ہیں۔ کیمرہ ورک اتنا خوبصورت ہے، کہ دنیا کے بڑے بڑے فلمکاروں کو بھی مات کرتا ہے۔ ایک ایک فریم فن کی بلندیوں کو چھوتا ہے۔ کیمرہ ایک ہی وقت آپ کو میلوں میں پھیلا منظر دکھانے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ اور جب فوکس ہوتا ہے، کسی چھوٹی سی چیز پر، تو وہ چیز آپ کے کلیجے میں اتر جاتی ہے۔ ناچتی ہوئی لڑکیوں کے گھگروں کے گھیروں کو جس طرح کیمرہ پکڑتا ہے، وہ آپ کو فیلنی، گودارد، روسی، وائی کانتی اور سوراں جیسے دنیا بھر کے بڑے فلمکاروں کی کلا کی یاد دلاتا ہے۔

گھگروں کے گھیرے دیکھ کر مجھے فرانسسکو روسی کی "کارمین" کی یاد آئی۔ اس میں جو کارمین تھی، وہ اس فلم کی سون بائی ہے۔ اس فلم میں کارخانہ تمباکو کا تھا۔ جس میں کام کرنے والی بھی ساری عورتیں ہی تھیں، اور کارمین، جیسے ستاروں میں چاند۔ اس فلم میں کارخانہ مرچ مصالحہ پیستا ہے، اور سمیتا پاٹیل جیسی معمولا اور دلیر لڑکی ہے سون بائی۔ گھگروں کے گھیروں نے گھوم گھوم کر اس فلم میں بھی تباہی مچائی تھی۔

کہانی ہے، کچھ کے علاقے کے ایک چھوٹے سے ریتلے سے گاؤں کی۔ اور گاؤں کے سیدھے سادے معصوم لوگوں کی۔ مردوں کے اوپر کھلے گھیروں والے، اور نیچے تنگ پائجامے، اور ڈھیر ساری چونٹوں والے فراک جیسی چھوٹے کرتے، اور سر پر رنگین

پگڑیاں۔ عورتوں کے گھگرے اور چولیاں اور اوڑھنیاں گہرے دال چینی، اودے کالے، اور سبز اور کیسری بُوٹیاں اور بوٹیوں بیچ لگے ہوئے شیشے۔

اور آس پاس ریت..... بے شمار ریت۔

گاؤں کے باہر صوبیدار (نصیر الدین شاہ) اپنے لاؤ لشکر سمیت مالیہ وصول کرنے کے لئے اُترا ہے۔ اُس کے گھوڑے، اُس کے سپاہی۔ سب جیسے گاڑ کر رہ رہے ہیں۔ گاؤں کے لوگ صوبیدار کے پاس آکر سلام کرتے ہیں۔ اور گھر سے راشن پانی پہنچاتے ہیں۔ رات کو اس کو گاؤں کی کوئی نہ کوئی لڑکی بھی لا دیتے ہیں۔ اس کے علاوہ اس اس کے سپاہی جب دل کرے، لوگوں کے گھروں سے اُن کی لڑکیاں اور بکریاں اُٹھا لاتے ہیں۔ کوئی چوں نہیں کرتا۔

گاؤں کا مکھیا ہے، سریش اوبرائے، اور بانیئے سیٹھ کا رول کیا ہے، رام لال بجاج نے۔

گاؤں میں ایک سیدھا آدمی ہے (راج ببر) اس کی بیوی سون بائی (سمیتا پاٹل)۔ زمین نے مکھیا نے ہڑپ لی ہے، اور راج روزی روٹی کمانے کے لئے شہر چلا جاتا ہے۔

سون بائی سیٹھ کے مرچ مصالحوں کے کارخانے میں گاؤں کی دوسری عورتوں کے ساتھ کام کرتی ہے۔ لال سُرخ مرچوں کے ڈھیر لگے ہیں، اور عورتیں گاتیں، ہنستیں، گپیں ہانکتیں، اور دوپہر کو سُوکھی باجرے کی روٹی پیاز اور سبز مرچ کے ساتھ کُترتیں، وہاں مزدوری کرتی ہیں۔ مرچوں کو کوٹتی، پیستی اور چھانتی ہیں۔

ایک رات، تہوار میں عورتوں کو ناچتی دیکھنے کے لئے صوبیدار بھی آجاتا ہے، اور سون بائی پر اس کی نظر جم کر رہ جاتی ہے۔

اگلے روز وہ اس کو تالاب پر کپڑے دھوتے دیکھتا ہے۔ مگر وہ اس کی نظر کی مَیل کو دیکھ کر بھاگ اُٹھتی ہے۔

اس سے اگلے روز پانی بھرنے جاتی کو صوبیدار گھیر لیتا ہے، اور اس کا بازو تھا

ہے۔ سون بائی نے زوردار تھپیڑا اس کے مُنہ پر مارا، اور دوڑ پڑی۔ پیچھے پیچھے صوبیدار کا سارا لاؤ لشکر۔ گھوڑوں پر سوار سپاہی۔ جس طرح جنگل میں ہرنی کا شکار کر رہے ہوں۔

بھاگتی بھاگتی وُہ مرچوں والے کارخانے میں آگھسی۔ کارخانے کا بوڑھا چوکیدار (اوم پوری) اس کی بات سمجھ کر کارخانے کا بڑا بھاری پھاٹک اندر سے بند کر لیتا ہے۔

ساری عورتیں اس کو خوش قسمت سمجھتی ہیں، جو اس طرح جان بچا کر بھاگ آئی۔ ورنہ آج تک تو صوبیدار کے ہاتھ سے کوئی بچی ہی نہیں۔

پھر سب دوبارہ اپنے اپنے کام میں مصروف ہو گئیں۔

لیکن صوبیدار تھپیڑ کو کس طرح بھلا دیتا؟ اس نے گاؤں کے مُکھیا کو بُلا کر حکم دیا، کہ سون بائی کو شرافت سے میرے حوالے کر دو، ورگرنہ گاؤں کی اینٹ سے اینٹ بجا دُوں گا۔

فوراً گاؤں کی پنچایت اکٹھی ہو گئی۔ مالا پھیرتا ہوُا گاؤں کا پنڈت، سکول ماسٹر، دھوبی، ڈاکیہ، کسان، سب۔ سب مرد۔ سب نے فوراً فیصلہ کیا، کہ گاؤں کو بچانے کے لئے سون بائی کو صوبیدار کے حوالے کر دیا جائے۔ ان میں سے صرف دھوبی بولا، 'اب تو اس گاؤں میں چوڑیاں بہت فروخت ہوں گی۔ سب مردوں نے بھی پہننی ہوں گی'۔ وہ اس کو مارپیٹ کر پنچایت سے نکال دیتے ہیں۔ سکول ماسٹر (بینجامن گیلانی) بھی تھپیڑ کھاتا ہے، کیونکہ اس نے بھی مخالفت کی ہے۔

(اس سین سے اپنے ملک کی حالت یاد آگئی۔ یعنی کہ صاحبان، ہے تو ڈیموکریسی، لیکن خبردار اگر کسی نے چوُں چراں کی۔)

خیر، سب مِل کر مرچوں کے کارخانے پہنچے، سپاہیوں کو ساتھ لے کر۔ مگر چوکیدار نے دروازہ کھولنے سے انکار کر دیا۔ اس نے کہا، گاؤں میں ابھی ایک مرد موجود ہے۔ میں ان عورتوں کی اور سون بائی کی حفاظت کروں گا، اور وہ بندوق تان کر کھڑا ہو گیا۔

اب تمام عورتیں بھی سوہن بائی کو کوسنے لگیں "تمہاری وجہ سے ہم سب پر آفت آپڑی ہے۔ چلی جاؤ گی، تو کیا گھس جاؤ گی؟"

مگر مکھیا کی عورت (دیپتی نول) گاؤں کی باقی عورتوں کو اکٹھا کرتی ہے، اور سب اپنے مردوں کی لکڑی کی تھالیاں بجاتی ہوئیں گلی میں آملتی ہیں۔ خاموش عورتوں کا یہ احتجاج بے حد اثر دار طریقے سے فلمایا گیا ہے۔

اور پھر صوبیدار خود آتا ہے، اور دروازہ توڑنے کا حکم دیتا ہے۔ بڑھ۔ دروازہ ٹوٹتے ہی چوکیدار کو گولیوں سے بھون دیا جاتا ہے۔ اس سچے اور ایماندار اور مردانگی سے بھرے بزرگ کے خون میں کوئی ایسی تاثیر تھی، کہ تمام عورتیں مرچیں اٹھا اٹھا کر صوبیدار پر پھینکنے لگتی ہیں۔ سمیتا پاٹل بھی درانتی پکڑ کر کھڑی ہے، اور مرچوں سے اندھے ہوئے چیختے چلاتے سور جیسے صوبیدار کی طرف بڑھتی ہے۔

فلم یہاں پر ختم ہو جاتی ہے۔

دوسری فلم جس کا میں ذکر کرنا چاہوں گی، وہ ہے 'یہ وہ منزل تو نہیں'۔ اس میں تین پرانے دوست (تینوں تھیٹر کے مشہور ڈائریکٹر، منوہر سنگھ، تنویر حبیب، اور بی۔ ایم۔ شاہ) جو اب ریٹائرڈ ہو چکے ہیں، اور اپنی اپنی گزری زندگی کی تکلیف اٹھائے پھرتے ہیں، اپنی چالیس سال پہلے چھوڑی ہوئی یونیورسٹی کی گولڈن جوبلی پر جانے کی تیاری کر رہے ہیں۔ راجگڑھ۔

راجگڑھ میں بیگ (تنویر حبیب) کی ایک پرانی حویلی ہے، جس میں تینوں رہیں گے۔ حویلی کی صفائی کرانے کے لئے شمشیر (منوہر سنگھ) نے اپنے بھتیجے کو لکھ دیا ہے، جو آج کل راجگڑھ میں ہی پولیس سپرنٹنڈنٹ لگا ہوا ہے۔ تیسرے دوست مرلی (بی۔ ایم۔ شاہ) نے نہ شادی کرائی ہے، اور نہ ہی زندگی میں اور کوئی کام کیا

ہے، سوائے شراب پینے کے۔

گاڑی میں اُن کو ایک جرنلسٹ لڑکی ملتی ہے، جو کسی خبر کی انوسٹی گیشن کرنے راجگڑھ ہی جا رہی ہے۔

راجگڑھ پہنچ کر پتہ چلتا ہے، کہ شہر میں بڑا تناؤ ہے۔ ترویٹی کمپنی میں پانچ مزدور مر گئے ہیں۔ جن کی موت کی وجہ پولیس اور فیکٹری والے ایکسیڈنٹ بتا رہے ہیں۔ لیکن اُن پانچوں کو ہڑتال ختم کرنے کے لئے اُٹھا کر بوائلر میں جھونک دیا تھا۔ کوئی چوں نہیں کر سکتا۔ کیونکہ ترویٹی کمپنی کے مالک منسٹر کے بھائی ہیں، اور بڑے دھانسو قسم کے نیتا ہیں۔ شہر کے کلب میں ترویٹی کی جی حضوری کرنے والوں میں پولیس کے ڈی۔آئی۔جی، ایس۔پی، ڈپٹی کمشنر اور یونیورسٹی کے وائس چانسلر شامل ہیں۔

یونیورسٹی میں بھی بہت تناؤ ہے۔ کیونکہ مزدوروں کی موت بارے بات کرنے والے ایک لڑکے لاکھن کو قتل کر دیا گیا ہے، اور لڑکوں کے لیڈر، روہت (پنکج کپور) نے قتل کرنے والوں کو خود اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ قتل کرنے والے تھے، ترویٹی کا بیٹا، اور اس کے غنڈے ساتھی۔ اس لئے وہ اب روہت کو بھی قتل کر دینا چاہتے ہیں۔

روہت کے دوست ہڑتال پر ہیں۔ یونیورسٹی بند ہے۔ پولیس کو وائس چانسلر واپس بھیج دیتا ہے، اور لڑکوں کے آگے منت کرتا ہے، کہ وہ گولڈن جوبلی فنکشن کو پُر امن گزر جانے دیں۔ بعد میں وہ لاکھن کے قتل کی پوری تفتیش کروائے گا۔

گولڈن جوبلی فنکشن میں صرف سیاسی نیتا کی اور ترویٹی کی چمچہ گری ہوتی ہے۔ روہت اُٹھ کر کہتا ہے، کہ وہ اور اس کے ساتھی یونیورسٹی میں پڑھنے کے لئے آئے ہیں، امن امان سے پڑھنا چاہتے ہیں، مگر غنڈہ گردی کے سامنے ان کی کوئی پیش نہیں چلتی۔ لاکھن کے قاتلوں کو پکڑا جائے، اور یونیورسٹی میں امن ہو۔

اس شام ترویینی کا بیٹا اور اس کے چار ساتھی روہت کو قتل کرنے کے لئے پھر یونیورسٹی ہوسٹل میں آگئے ہیں۔ باقی لڑکے اُن کو پکڑ کر کمرے میں بند کر دیتے ہیں، اور وائس چانسلر کو بلاتے ہیں۔ لیکن ترویینی اپنے بیٹے کو چھڑانے کے لئے پولیس کمشنر کو حکم دیتا ہے، کہ پوری فورس لے کر یونیورسٹی جاؤ، اور وائس چانسلر بھی اُن سے ڈرتے ہوئے دستخط کر دیتا ہے، کہ ہوسٹل میں پولیس کے داخلے پر اس کو کوئی اعتراض نہیں۔

پوری یونیورسٹی کے لڑکوں میں خوفناک غصہ جاگ پڑتا ہے، اور وہ ہوسٹل میں باقاعدہ ناکہ بندی کر کے پولیس کا مقابلہ کرتے ہیں۔ مگر ایک طرف نہتے لڑکے، اور طرف بندوقوں، پستولوں سے لیس پولیس۔ خوفناک مقابلے کے بعد وہ ترویینی کے بیٹے کو چھڑا لیتے ہیں، اور کئی لڑکوں کو زخمی کر کے اور کئی کو حراست میں لے کر چلے جاتے ہیں۔

روہت بھی زخمی ہے، مگر ایک سپاہی کی موت کا قصوروار اس کو ٹھہرایا جاتا ہے۔ اور پورے شہر کی پوری پولیس اس کو ڈھونڈتی پھرتی ہے۔ ترویینی کا بیٹا، اور اس کے غنڈے ساتھی اپنے طور پر اس کو تلاش کرتے ہیں۔

گولڈن جوبلی فنکشن کے وقت اُن تینوں دوستوں کو ان کی ایک پرانی کلاس فیلو عصمت مل گئی تھی۔ جس کو دیکھ کر وہ تینوں بُری طرح بوکھلا گئے تھے، اور انہوں نے اس کو پہچاننے سے انکار کر دیا تھا۔ شام کو وہ ڈھونڈتی ڈھونڈتی بیگ کے گھر آ پہنچی۔ اور پھر آہستہ آہستہ ماضی بے نقاب ہونے لگا۔ چالیس سال کے بعد وہ تینوں اپنی آتماؤں پر پڑی ہوئی بھاری سلیں ہٹاتے ہیں، اور اس کے سامنے قبول کرتے ہیں، کہ اُنہوں نے ہی اپنے جانباز شری کانت کو مروا دیا تھا۔ دراصل وہ تینوں، اور اُن کا دوست شری کانت انقلابی تھے۔ انگریز کمشنر کی جیپ پر بم پھینکنے کا انہوں نے فیصلہ کیا تھا۔ لیکن عین آخری وقت پر تینوں بھاگ گئے، شری کانت بم پھینک کر فرار ہو گیا۔ بعد میں پولیس نے تفتیش کی، اور ان تینوں کو کہا، کہ اگر وہ شری کانت کو پکڑنے میں پولیس کی مدد کریں گے، تو ان تینوں

تینوں کو معافی مل جائے گی۔

شری کانت نے جب ان تینوں کو پیغام ملنے کے لئے بھیجا، تو مُرلی نے ملنے کے لئے جگہ مقرر کر لی۔ پولیس بھی وہاں موجود تھی، جب شری کانت اُن کو ملنے کے لئے آیا۔ بھیانک رات۔ خوش خوش اپنے دوستوں کی طرف آتے شری کانت کو پولیس کی گولیوں نے بھون دیا۔

اس کہانی کے درد میں وہ چاروں ڈوبے بیٹھے تھے کہ باہر روہت بھی بے حد زخمی حالت میں ان کی حویلی کے پچھواڑے آ چھپا۔ اُس جرنلسٹ لڑکی نے اس کو دیکھ لیا، اور بچاتی ہوئی بیگ کے گھر لے آئی۔ شمشیر اور مُرلی اس کو گھر رکھنے کے حق میں نہیں تھے، کیونکہ پولیس والا تو خود شمشیر کا بھتیجا تھا، اور کسی وقت بھی اُن کو ملنے آ سکتا تھا۔ اور وہ اس پولیس کے لفڑے میں کیوں پڑیں؟ مگر بیگ نے کہا، کہ گھر تو اس کا ہے، اور اس کے گھر سے ایک بے قصور زخمی پناہ گزین کو کس طرح نکال سکتے ہیں! اس لئے روہت کو اُنہوں نے وہیں رکھ لیا۔

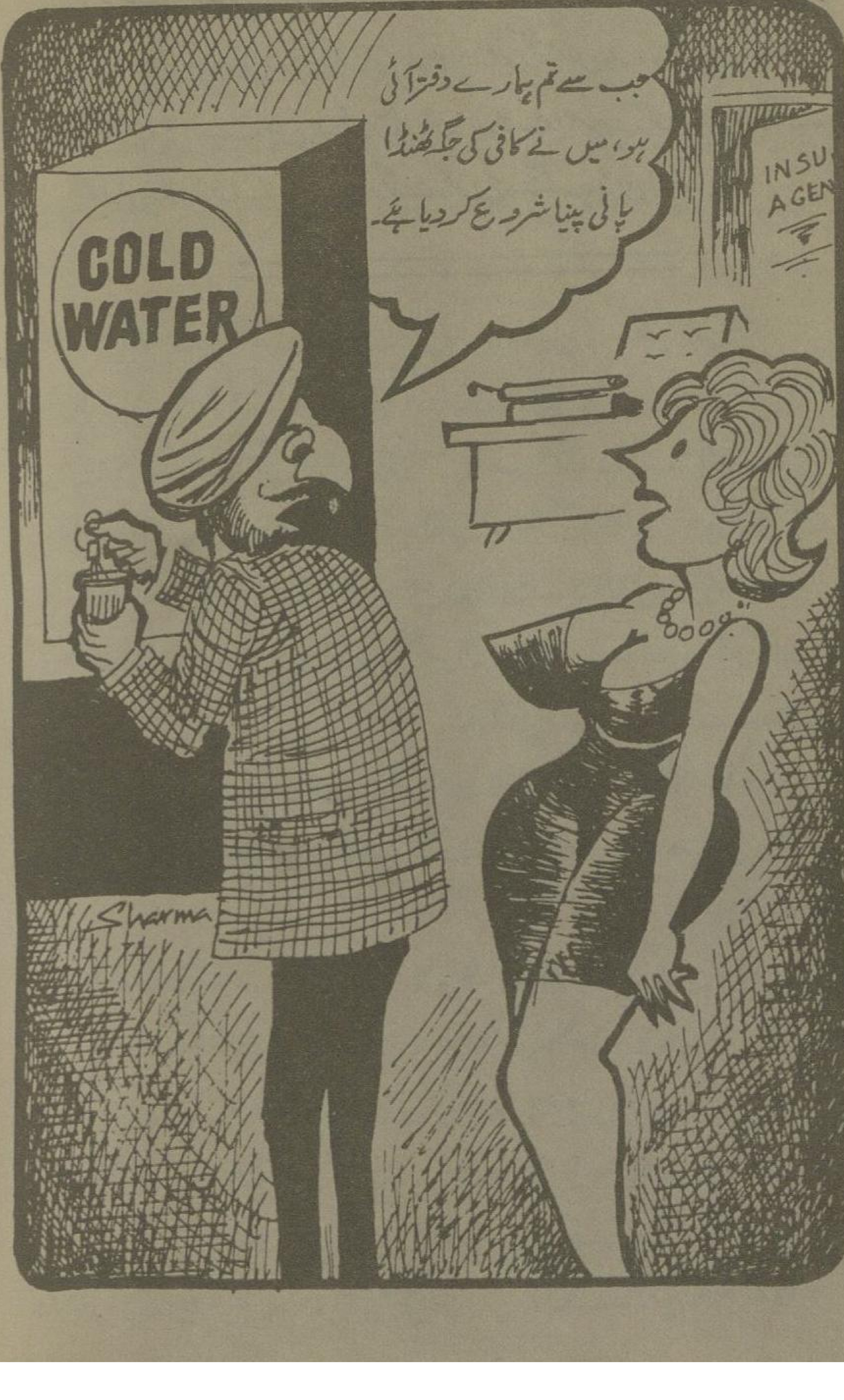
اگلے روز شمشیر نے اپنے بھتیجے سے کار مانگ لی، اور روہت کو بچاتے ہوئے وہ تینوں شہر سے باہر کسی قصبے کے بسوں کے اڈے پر پہنچا آئے۔ جرنلسٹ لڑکی روہت کے ساتھ ہی تھی۔

واپس آتے وقت وہ اتنے خوش تھے، جیسے کوئی جنگ جیت کر آئے ہوں۔ چالیس سال پہلے جو ان کا ضمیر زخمی ہوا تھا، وہ اب پُر شفاف اور سُرخرو کھڑا تھا۔

مگر روہت نہیں بچ سکا۔ شکاری کتوں کی طرح سونگھتے ہوئے تروینی کا بیٹا اور اس کے غنڈے ساتھی اس بس کا پیچھا کرتے رہے۔ ایک جگہ پر بس رُکی۔ لوگ چائے پانی پینے لگے، تو اُنہوں نے روہت کو آ گھیرا۔ چالیس سال پہلے آزادی کی جنگ میں جس جس طرح شری کانت گولیوں سے چھلنی کیا گیا تھا، اسی طرح آج روہت ان غنڈوں

کی گولیوں سے چھلنی ہو گیا۔

چالیس سالوں میں کچھ نہیں بدلا، دوستو، کچھ نہیں بدلا۔ مظلوم اپنے قتل کا فرمان آج بھی اپنی جیب میں پائے پھرتا ہے۔ بدلا ہے، صرف گولیوں کا رنگ اور گولیاں چلانے والے ہاتھوں کا رنگ۔ خون کا رنگ وہی ہے۔


جب سے تم ہمارے دفتر آئی
ہو، میں نے کافی کی جگہ ٹھنڈا
پانی پینا شروع کر دیا ہے۔
COLD WATER
INSU
AGEN
Sharma


۔سنتو سنگھ! اب ہم شادی کروا ہی لیں۔
۔مگر ڈارلنگ پھر میں شام کس کے ساتھ گزارا کروں گا؟


میں نے کہا ڈارلنگ، یہ گڑی کی خوشبو کہاں



اجیت کور